بدلتی ہوئی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

نام کتاب = بدلتی ہوئی تاریخ
مصنف = ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ' لاہور
فون :7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = المطبعتہ العربیہ لاہور .
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1997ء
قیمت = -/120 روپے

انتساب

حیدر آباد سندھ کے ماہر امراض چشم

ڈاکٹر مجاہد صدیقی کے نام

(ان کی محبت، خلوص، اور علم دوستی کے اعتراف میں)

فہرست

حصہ سوم: ہم تاریخ سے کیوں نہیں سیکھتے؟

پیش لفظ

اب اگر میری کوئی نئی کتاب چھپتی ہے تو میں اسے بتاتے ہوئے ذرا شرماتا بھی ہوں اور گھبراتا بھی ہوں' کیونکہ کچھ دوستوں کو یہ شکایت ہو گئی ہے کہ میں اس قدر تیزی سے کیوں اور کیسے لکھتا ہوں؟ ویسے اس کا جواب تو میرے پاس نہیں' مگر جب بھی میرے ذہن میں کوئی نیا خیال آتا ہے یا نیا موضوع سر اٹھاتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اسے تحریر میں لے آؤں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اس میں شریک کروں۔ بس یہی جذبہ ہے جو مجھ سے برابر لکھواتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اپریل 1997ء لاہور

حصہ اول

خواص و عام

اس وقت دنیا کے تمام معاشروں میں خواص و عام کے درمیان ایک فرق موجود ہے۔ یہ فرق صرف خواص و عوام تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے بعد بھی درجہ بندیاں ہیں' یہ درجہ بندیاں دولت و اقتدار اور خاندان و حسب و نسب کی بنیادوں پر ہیں۔ معاشرے میں خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے کے لئے جو سہارے لئے جاتے ہیں ان میں یہ دو اہم بنیادیں ہیں' بلکہ دولت و اقتدار کو استعمال کر کے خاندان و حسب و نسب میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ جب اختیارات ملتے ہیں تو دوسرے لوگوں پر نہ صرف حکومت کی جاتی ہے بلکہ انہیں ذلیل و کمتر بنا کر ان کی عزت و عظمت کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔

یہ درجہ بندیاں تو رہتی ہیں' مگر عوام و خواص کے درمیان تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ عوام کے لوگ خواص میں اور خواص کے نمائندے عوام میں بدلتے رہتے ہیں۔ سوائے ہندو مذہب کے جہاں ذات پات کی تقسیم ناقابل تبادلہ ہوتی ہے اور پیدائش کے ذریعہ کسی فرد کی ذات کا تعین ہو جاتا ہے۔

جو خاندان ایک مرتبہ خواص میں شامل ہو جاتے ہیں' وہ اپنے سماجی مرتبہ اور اپنی اہمیت کے تحفظ کے لئے اپنے شجرے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اگر زمانہ کے حالات میں وہ دولت اور مادی وسائل سے محروم ہو جائیں تو ان شجروں کی مدد سے اپنے وقار کو بچانے کی آخری جنگ لڑتے ہیں۔ اس سلسلہ کی دلچسپ مثال نادر شاہ کی ہے کہ جب اس نے مغل شہزادی سے اپنے لڑکے کی شادی کی' اور شادی کے وقت اس سے شجرہ معلوم کیا گیا تو اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر کہا کہ نادر شاہ ابن شمشیر' ابن شمشیر' ابن شمشیر۔ اس کے بعد کسی اور تو اس کے خاندان کے بارے میں معلومات کی ہمت نہیں ہوئی۔

خواص و عوام میں فرق رکھنے کے لئے سب سے اہم چیز ثقافت ہوتی ہے۔ ادب آداب' رہن سہن' کھانا و پینا' رہائش' زبان' حرکات و سکنات و عادات' وہ چیزیں ہیں کہ جو ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیتی ہیں۔ خواص کے نمائندے اپنے رکھ رکھاؤ' اور تہذیب و تمدن کے معیار کی وجہ سے عوام سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام کے بارے میں ہمیشہ سے ہی یہ نقطہ نظر رہا ہے کہ یہ جاہل' گنوار' اجڈ' بدتہذیب' رذیل' اوباش' نکمے' اور جاہل ہوتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی وجہ حکمرانوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کو سختی و طاقت اور تشدد سے ٹھیک کیا جائے۔ ہم آج سے یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کو صرف ڈنڈے کے زور سے ہی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ بھی حکمرانوں کے حق میں رہا ہے کہ عوام کو جاہل رکھا جائے تاکہ ان پر آسانی سے حکومت کی جا سکے۔ کسی ایک مفکر نے حکمرانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عوام کے پیٹ بھرے رکھیں' مگر ان کے ذہنوں کو اونچا نہیں کریں۔ ان کے بازوؤں کو مضبوط بنائیں' مگر ان کے کردار کو کمزور رکھیں۔

ہندو مفکرین نے تو بادشاہ کے ادارے کے وجود میں آنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ عوام کی نااتفاقی' بے ترتیبی' انتشار' اور بدامنی کی وجہ سے دیوتاؤں نے اس دنیا میں بادشاہ کو بھیجا۔ لوگوں نے بادشاہ کو خوشی خوشی اس لئے قبول کیا کہ اس نے معاشرہ میں ترتیب' نظم و ضبط اور امن و امان کو پیدا کیا۔ اس لئے معاشرہ کو پرامن رکھنے کے لئے ذات پات کی تقسیم ضروری تھی تاکہ ہر شخص کو اپنے درجہ کے بارے میں معلوم ہو اور وہ اسے اپنا دھرم سمجھ کر اس پر مطمئن رہے۔ اس دھرم نے شودر کو تعلیم سے محروم کر کے' اونچی ذاتوں کی حکمرانی قائم کر دی۔

ارتھ شاستر کا مصنف کوٹلیہ کا کہنا ہے کہ بادشاہ جب بھی مشیروں کو مقرر کرے تو یہ خیال رکھے کہ ان کا تعلق اعلیٰ خاندان سے ہو۔ وہ اس کا قائل ہے کہ اگر وباء' قحط پڑیں تو اس میں عوام اور نیچی ذات کے لوگوں کو زیادہ تعداد میں مرنا چاہئے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ عوام کی اکثریت ہوتی ہے اس لئے اگر وہ زیادہ تعداد میں مر بھی جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا' مگر کمینوں کی خاطر اشراف کو نہیں مرنا چاہئے کیونکہ فراست و دانشمندی میں ایک اشراف ہزاروں کمینوں پر بھاری ہوتا ہے۔

میسو پوٹامیہ کے قدیم معاشرے میں سماج تین درجوں میں تقسیم تھا: کاہن' بادشاہ' اور عوام' کاہن چونکہ الوہی قوتوں کا مالک تھا' اس لئے اس کا درجہ بادشاہ سے بھی بلند ہوتا تھا۔ رسم یہ تھی کہ کاہن بادشاہ اور عوام کے لئے دعا مانگ سکتا تھا' بادشاہ اپنی رعیت کے لئے دعائے خیر کر سکتا تھا' مگر عوام کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ کاہن یا بادشاہ کے لئے دعا کریں۔ کاہن چونکہ خدا کے قریب تھا اس لئے اسے دعا کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

اسلام نے اگرچہ مساوات پر زور دیا ہے' مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف نظریاتی طور پر ہی رہا' عملی لحاظ سے اسلامی معاشرہ بھی خواص و عوام اور سماجی طور پر درجہ بندیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ 800ء میں ایک برکلی وزیر نے اسلامی معاشرے کو اس طرح سے تقسیم کیا تھا:

(1) حکمراں: طاقت' لیاقت' اور صلاحیت کی علامت

(2) وزیر: دانشمندی کا مجسمہ

(3) امراء: دولت رکھنے والے

(4) متوسط طبقہ: تعلیم کی خصوصیت کا حامل

(5) عوام: گندے و نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے' حیوان نما' جن کا زندگی میں سوائے کھانے سونے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

اس سے ملتا جلتا نظریہ 903ء میں ابن الفقیہہ نے دیا کہ جس نے معاشرے کو چار درجوں میں تقسیم کیا۔ بادشاہ' وزراء' دولت مند' تہذیب و تمدن والے' ان کے علاوہ سب کوڑا کرکٹ' ندی کے جھاگ' اور جانور بتایا ہے کہ جنہیں کھانے و سونے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں خواص و عوام کے بارے میں نظریات بدلتے رہے۔ مگر اس کی عمومی تعریف جسے سب نے تسلیم کیا وہ یہ تھی کہ خواص کا تعلق حکومت' سیاست' انتظامیہ' فوج اور مذہبی طبقوں سے ہے۔ اس میں تاجروں اور زمینداروں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ ن کے مقابلہ میں عوام کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ جاہل' ان پڑھ' غریب' محتاج اور مجبور ہیں۔

ایک اور فرق کو شریف اور ضعیف کے ذریعہ ادا کیا گیا۔ شریف وہ کہ جو اعلیٰ خاندان

میں پیدا ہوا ہو اور اعلیٰ اخلاقی صفات کا حامل ہو۔ ضعیف، پیدائشی طور پر کم تر اور غیر مسلح۔ چونکہ قرون وسطی کے اسلامی معاشرے میں ہتھیار رکھنا طبقہ اعلی یا خواص کے لئے مخصوص تھا اس لئے جو اس مراعت سے محروم تھے وہ عوام تھے۔

بعد میں شریف ان افراد کو کہا گیا کہ جو پیغمبرؐ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں ہر صوبہ اور شہر میں سیدوں کے بارے میں پوری تفصیلات ہوتی تھیں اور انہیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مراعات دی جاتی تھیں۔ یہی صورت ہندوستان میں تھی کہ جہاں حکمراں سیدوں کو زمینیں، عطیات، اور تحفہ تحائف دیتے تھے۔

معاشرے میں جب ایک بار درجہ بندی ہو جاتی تھی تو مراعات یافتہ طبقوں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس تقسیم کو برقرار رکھیں۔ اس کی گنجائش تو تھی کہ انفرادی طور پر دوسرے طبقے کے افراد اپنا سماجی مرتبہ بدل لیں اور نچلے سے اعلیٰ میں آ جائیں۔ لیکن اگر کسی بحران، جنگ، یا کسی انتشار کی وجہ سے یہ درجہ بندی ٹوٹ جاتی تھی اور مراعات یافتہ طبقے اپنی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے تو ان کے لئے یہ صورت حال زوال کا باعث ہوتی تھی وہ یہ برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے کہ رذیل اور غریب عوام ان جیسی مراعات کے مستحق ہو جائیں۔ اس لئے جب بھی کوئی معاشرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تو یہ لوگ نوحہ کناں ہو گئے اور دنیا کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

یورپ میں بھی قرون وسطی میں عوام کے بارے میں جو تصورات تھے وہ یہ کہ یہ جنگلی اور بغیر نہائے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے جسموں پر صرف بارش کا پانی پڑتا ہے۔ یہ جہنمی اور بدصورت ہیں۔ ان میں کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی، یہ باغی اور مسخرے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو وفادار اور جرائم سے دور رکھنے کے لئے سخت سزائیں دینی چاہئیں۔ جیسے دانت نکال دینا، صلیب پر زندہ لٹکا دینا، آنکھیں نکالنا، ہاتھ کاٹنا، پیر جلانا۔ پگھلتے ہوئے سیسہ میں ڈال دینا وغیرہ۔

جرمنی میں تیرہویں صدی تک یہ دستور تھا کہ اگر کسان کا لڑکا جاگیردار کے لڑکے کی نقل میں لمبے بال رکھتا، صاف اور اچھے جوتے پہنتا، کڑھے ہوئے کپڑے استعمال کرتا تو اسے سزا ملتی تھی۔ ایک ایسے ہی لڑکے کے باپ نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "

جو اپنے سماجی رتبہ سے بغاوت کرتا ہے وہ زندگی میں ناکام ہوتا ہے۔ تیرا کام ہل چلانا ہے۔
" وہ لڑکا ردعمل میں ڈاکو بن گیا اور جاگیرداروں کو قتل کرتے ہوئے کسانوں کو تنگ کرنے لگا' انہیں لوٹتا بھی تھا اور سزائیں بھی دیتا تھا۔ آخر میں کسانوں نے پکڑ کر اسے مارا اور الٹا لٹکا دیا۔ یہ وہ سزا تھی جو وہ اپنے جاگیردار کو نہیں دے سکے تھے۔

چرچ نے بھی ہمیشہ خواص کا ساتھ دیا۔ کیونکہ چرچ کے عہدے دار بھی طبقہ خواص سے تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ رعیت پر زور دیتے تھے کہ وہ حکمراں طبقوں کی وفادار رہے اور اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہے۔

1552ء میں جب فرانس کا بادشاہ چارلس ایک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھا' تو جنگ کے دوران اس نے پوچھا کہ کون لوگ مر رہے ہیں' تو جواب ملا کہ عوام۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ اگر وہ شریف لوگ نہیں ہیں اور غریب عوام ہیں تو ان کی مثال تو ٹڈیوں اور کیڑے مکوڑوں کی سی ہے۔ اگر یہ مرتے ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں۔

انگلستان میں امراء کو ان کے طبقہ اور سماجی مرتبہ کے حساب سے خطاب کیا جاتا تھا' مثلاً ڈیوک کو رائٹ آنریبل' مارکوئس' دی لارڈ' ارل کو مائی لارڈ' وائس کونٹ کو یور ہائی گریس' بارونیٹ کو سر' جنٹلمن کو مسٹر۔ جنٹلمن کی تعریف یہ تھی کہ وہ کسی تعلیمی ادارے کا پڑھا ہوا ہو' میڈیسن یا لبرل علوم کا ماہر ہو' یا فوج میں کیپٹن رہا ہو' اس کی اس قدر آمدنی ہو کہ اسے محنت مزدوری کرنے یا کام کرنے کی ضرورت نہ ہو' اس کے لئے دولت مند ہونا لازمی شرط تھی۔ عام لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کرسچن نام رکھ سکیں یا کوئی خاندانی نام اختیار کریں۔ ان کا صرف پہلا نام ہوتا تھا جیسے پیٹر' اسمتھ وغیرہ۔ یہ سترھویں' اٹھارویں' اور انیسویں صدیوں میں جا کر آہستہ آہستہ ہوا کہ عام لوگوں نے پورے نام رکھنا شروع کر دیئے۔

یورپ میں سرمایہ داری کے ارتقاء کے ساتھ جب معاشرہ ٹوٹا تو فرد اپنی برادری سے دور ہوتا چلا گیا اور جب اس نے فرد کی آزادی کی بات کی تو خواص میں اس کے خلاف زبردست جذبات پیدا ہوئے' اور ایسے لوگوں کو Rabble کہا گیا۔

میکسی ملن بادشاہ نے عوام کو بدمعاش' بیوقوف کسان اور اجڈ کہا کہ جن میں نہ تو اخلاقی قدریں ہوتی ہیں اور نہ شریفانہ خون۔ وہ صرف بے وفائی' بغاوت' اور نفرت کرنا

جانتے ہیں۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں جمہوریت کے ارتقاء کے ساتھ ہی عوام کے لئے بدمعاشوں کا "جمگھٹا" آدمیوں کی شکل میں جانور اور بدعنوان نام استعمال کئے گئے۔ انگلستان میں جمہوریت کے علمبردار کہتے تھے کہ عوام کو ان کی اپنی جگہ پر رکھنا چاہئے تاکہ ذمہ دار اور خواص ان لوگوں کے شوروغل اور ہنگامہ سے دور رہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق عوام کا کام سیاسی و سماجی اور معاشی عمل میں حصہ لینا نہیں بلکہ صرف اسے دیکھنا ہے۔ انہیں چاہئے کہ دخل اندازی سے دور رہیں۔ عوام کے بارے میں یہ کہاوت بھی خواص کے ذہن کی غمازی کرتی ہے کہ "ہمیں اس کے کام کی تو تعریف کرنی چاہئے' مگر بحیثیت کام کرنے والے اس سے نفرت کرنی چاہئے۔"

سرمایہ داری اور صنعتی ترقی کے زمانہ میں عوام کو پوری طرح سے استعمال کیا گیا۔ ان سے فیکٹریوں اور کانوں میں کم مزدوری پر کام کرایا گیا۔ کچی' غلیظ آبادیوں میں رکھا گیا' ان کی توانائی کو استعمال کر کے دولت کمائی گئی۔ یہاں تک کہ محنت و مزدوری کی خاطر 1618ء میں چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو پکڑ کر نو آبادیات میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا کہ جہاں مزدوروں کی سخت ضرورت تھی۔ سرمایہ داروں نے عوام کا استحصال کرکے دولت کمائی' عوام کے استحصال کا یہ عمل آج بھی کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے ہر ملک میں جاری ہے۔

ایک عام آدمی انفرادی طور پر تو انتہائی کمزور ہوتا ہے' مگر جب یہ لوگ مل کر مجمع بناتے ہیں تو اس وقت ان کی زبردست طاقت ہو جاتی ہے۔ ایل یس کانیتی نے اپنی مشہور کتاب "طاقت اور مجمع" میں مجمع کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق مجمع ہمیشہ اپنی تعداد بڑھانا چاہتا ہے۔ جب مجمع میں لوگ مل جاتے ہیں تو وہ سب ایک ہو جاتے ہیں' اگر اس میں خواص کے افراد ہوں تو وہ بھی اس میں مل کر اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔ مجمع جب ایک بار اکٹھا ہو جاتا ہے تو پھر وہ تقسیم نہیں ہونا چاہتا بلکہ ایک جتھہ کی طرح آپس میں ملا ہوا رہنا چاہتا ہے۔ مجمع اپنی کوئی منزل چاہتا ہے کہ جس کی طرف وہ روانہ ہو' کیونکہ ایک جگہ رہنے میں اسے تقسیم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مجمع جب تک حرکت میں رہتا ہے وہ کھلا ہوا اور بڑھتا ہوا ہوتا ہے' جب رک جاتا ہے تو بند ہو جاتا ہے۔ وہ مجمع کی مثال آگ سے دیتا ہے کہ جس طرح آگ تباہی و بربادی پھیلاتی ہے اس طرح

مجمع لمحوں میں یہ کام کرتا ہے، جس طرح سے آگ بجھ کر اپنی اہمیت ختم کر دیتی ہے اسی طرح مجمع بکھر جائے تو اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ مجمع سمندر کی طرح ہوتا ہے جو وسیع و گہرا ہوتا ہے اور جس کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں اپنے سامنے کی ہر چیز کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ یہ بارش کی طرح ہوتا ہے کہ جو قطرہ قطرہ کر کے برستی ہے، مگر جب یہ قطرے مل کر زمین پر آتے ہیں تو ان سے زمین پر ندی نالے بن جاتے ہیں۔ اور یہ سیلاب بن کر خوفناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دریا کی مانند ہے کہ جو ایک ہی سمت میں بہتا ہے اور جس میں جگہ جگہ دوسری سمتوں سے ندی و نالے آ کر ملتے رہتے ہیں، اور اس کی قوت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال جنگل کی طرح ہے کہ جہاں درخت اپنی جڑوں کو زمین کی گہرائیوں میں دفن کئے کھڑے رہتے ہیں، اور اپنی جگہ سے ہلتے نہیں ہیں۔ یہ مجمع کی مزاحمت کی علامت ہے کہ وہ ایک جگہ جم کر مقابلہ کرتا ہے۔

مجمع جب اکٹھا ہوتا ہے تو اس وقت لوگوں کا آپس میں ملنا، اس میں محویت پیدا کر دیتا ہے۔ لوگوں کے قدموں کا آہنگ ایسے ہوتا ہے کہ جیسے رقص کیا جا رہا ہو۔ اس وقت مجمع مدہوشی کے عالم میں ہوتا ہے، وہ نعرے لگاتے ہیں، چیختے ہیں، آنکھیں اور زبان نکالتے ہیں، اور جب مخالف یا دشمن سامنے آ جائے تو اسے قتل کر دینا، اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، عمارتوں کو آگ لگانا، آنے والی چیزوں کو توڑنا پھوڑنا، اس سے انہیں اپنی طاقت کا احساس ہوتا ہے، اور تسکین ملتی ہے۔

جب ایک فرد مجمع میں ہوتا ہے تو اسے کوئی خوف نہیں ہوتا ہے، نہ سزا کا اور نہ قانون کی خلاف ورزی کا، لیکن مجمع جس طرح جمع ہوتا ہے، اسی طرح سے ذرا سی کسی بات پر بکھر بھی جاتا ہے، اور جب یہ بکھر جاتا ہے تو کمزوروں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

مجمع میں شامل ہونا ایک عام آدمی کے لئے ضروری ہے کیونکہ عام حالات میں وہ خود کو تنہا سمجھتا ہے۔ وہ نہ تو تاریخ سے واقف ہوتا ہے۔ اور نہ ہی زبان سے۔ اس کی شناخت مجمع سے ہوتی ہے، اس لئے جب وہ اس میں شمولیت کرتا ہے تو اس میں ایک نئی توانائی اور طاقت آ جاتی ہے، وہ خود کو اہم سمجھنے لگتا ہے۔ توڑ پھوڑ اس کو طاقت کا احساس دلاتی ہے۔ یہی اس کی زندگی کا سرمایہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سرمایہ ہے کہ جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے۔

ہنا آرنڈٹ نے اپنی کتاب "Origin of Totalitarianism" میں جدید زمانہ میں مجمع کے بارے میں لکھا ہے کہ بیسویں صدی میں یورپ میں جو آمرانہ حکومتیں پیدا ہوئیں' ان میں مجمع کا بڑا دخل رہا ہے۔ مجمع لوگوں کے اس بھیڑ کو کہتے ہیں کہ جو بیروزگار ہوتے ہیں' یہ لوگ کسی سیاسی جماعت کا حصہ نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی موجودہ نظام سے مطمئن۔ اس لئے جب ان کے سامنے کوئی نظریہ پیش کیا جائے تو یہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ اس میں ان کی نجات ہے۔ جب یہ نظریہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تو پھر ان کی طاقت پر آمرانہ حکومتیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اگر عوام سماجی' سیاسی اور ثقافتی جماعتیں بنا کر اپنے حقوق کی جنگ کریں گے تو اس صورت میں یہ مجمع کی شکل اختیار نہیں کریں گے۔ اگر سیاسی جماعتیں لوگوں کو اپنے اندر ضم نہیں کریں گی تو اس صورت میں آمرانہ حکومتیں ان کو جماعتوں' گروپوں' اور انجمنوں سے علیحدہ کر کے ان کے تعلق کو ختم کر دے گی اور انہیں ایک ایسے مجمع میں تبدیل کر دے گی کہ جو اس کے رحم و کرم پر ہو اور اس کے اشاروں پر حرکت کرے۔

جب یہ حالات پیدا ہو جائیں تو پھر آمروں' اور اقتدار کے خواہش مند شخصیتوں کے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ مجمع کو اپنے حق میں کر لیں۔ لیبوں نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اور مجمع" میں ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن کے ذریعہ شخصیتیں مجمع کو اپنے حق میں ہموار کرتی ہیں۔ جیسے خطابت کے ذریعہ ان کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ ایک خیلاتی دشمن تلاش کر کے ان میں اتحاد پیدا کیا جاتا ہے اور ان کی توانائیوں کو اس دشمن کو ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال جرمنی کی ہے کہ جہاں یہودیوں کے خلاف مجمع کے جذبات کو استعمال کیا۔

مجمع میں اس وقت اپنی طاقت اور سچائی کا احساس ہوتا ہے کہ جب وہ کسی تقریب کے موقع پر جمع ہو۔ اس وقت قومی نغمے اور جنگجو ترانے و گیت اس کے جذبات کو اکساتے ہیں اور اس کی عقل و ہوشمندی کو بالکل ختم کر دیتے ہیں' اس عالم میں وہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جب آمرانہ شخصیتیں اپنی تقریروں سے عوام کو سحرزدہ کر دیں تو یہ تباہی کی علامت ہوتی ہے۔

لیکن مجمع کو استعمال کرنے کا کام محض آمروں ہی نے نہیں کیا۔ اسے جمہوریت اور

سوشلسٹ معاشروں کے قیام کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ فرانسیسی انقلاب میں مجمع نے انقلاب کو کامیاب بنانے میں زبردست حصہ لیا۔ یہ مجمع ہی تھا کہ جس نے بیسٹل کا قلعہ مسمار کر کے بادشاہت کی علامت کو توڑا۔ یہ ہی بادشاہ اور اس کے خاندان کو ورسائی سے پیرس لائے' اور انہوں نے ہی اسمبلیوں کی نگرانی کی کہ وہاں ان کے نمائندے کیا کہتے ہیں۔ اس کے بعد سے جدید تاریخ میں مجمع کی حیثیت سے عوام کا کردار بڑھ گیا ہے۔ اب اسٹرائکیں' جلسے و جلوس عوام کی طاقت کا مظہر ہیں۔ اور جب بھی لوگ آپس میں ملتے ہیں' حکومتیں ان سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ ان کو آپس میں روکنے کے لئے قوانین بنائے جاتے ہیں تاکہ یہ جمع نہیں ہو سکیں اور حکومت کے خلاف اقدامات نہیں کر سکیں۔ جہاں ایک طرف عوام کی طاقت مجمع کی صورت میں بڑھ رہی ہے۔ وہیں دوسری طرف حکومتیں بھی ان سے نمٹنے کے لئے پولیس' فوج' اور مجمع کو توڑنے کے لئے تدبیریں اختیار کر رہے ہیں۔ اس لئے آنسو گیس' یا پانی کے پائپ کے ذریعہ پانی پھینک کر' یا گولیاں چلا کر' لاٹھی چارج کر کے' مجمع کو منتشر کرنا حکومتی طریقے ہیں۔ اس طرح عوام اور ریاست دونوں کی جانب سے یہ کش مکش جاری ہے۔ مگر حکومتوں کو کبھی یہ بھی سوچنا ہو گا کہ آخر مجمع کیوں مزاحمت کرتا ہے۔ اگر اس کا احتجاج صحیح ہے تو کیا یہ درست نہیں کہ اس کی بات کو سنا جائے۔

حکومتوں نے لوگوں کی بات سمجھنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی کہ وہ حکمت عملی بنائی جائے کہ جس کے ذریعہ مجمع کو منتشر کیا جا سکے۔ خصوصیت کے ساتھ یورپ میں انیسویں صدی میں عوامی انقلابی تحریکوں کے بعد بڑے بڑے شہروں کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ اس میں شاہراہوں اور سڑکوں کو چوڑا کیا تاکہ پولیس کو انہیں کچلنے میں اور ان پر قابو پانے میں آسانی ہو' ورنہ اس سے پہلے پرانے شہروں کی تنگ گلیوں میں انہیں دبانا مشکل ہوتا تھا۔ شہروں کا یہ طرز تعمیر ہمارے ہاں بھی نوآبادیاتی دور میں آیا اور جو شہر جدید بنائے گئے یا جہاں شہروں کے نئے حصے تعمیر ہوئے ان میں ان خصوصیات کا خیال رکھا گیا۔ خصوصیت سے 1857ء کے بعد ہندوستان میں نوآبادیاتی شہروں کی طرز تعمیر میں یہ حکمت عملی جھلکتی ہے۔ عوامی بغاوت کے پیش نظر ریلوے اسٹیشنوں کو قلعہ نما بنایا گیا تاکہ وہاں پناہ لی جا سکے۔

اور یہی کچھ صورت حال ابھی ہے کہ عوامی جلسے و جلوسوں سے بچنے کے لئے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں سرکاری عہدے دار ان اور افسروں وزیروں کے آفسوں پر سخت پہرے ہوتے ہیں' ان کے بنگلوں کی دیواریں اونچی ہو گئی ہیں' خاردار تار لگا دئے گئے ہیں' اور پہرے دار اسلحہ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان تمام اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ خواص کو عوام سے کیسے دور رکھا جائے۔

اسلام آباد کی تعمیر بھی اس کا ایک حصہ ہے کہ حکومت و اقتدار پر قابض لوگ ملک کے عوام سے دور اور ان کی نظروں سے اوجھل رہیں' اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ فرانس میں ورسائی کی تھی۔ اسی لئے جب عوام کی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس میں اسلام آباد کی طرف مارچ اہم ہوتا ہے تاکہ خواص کے اس قلعہ کو تسخیر کیا جائے۔

ٹالسٹائی اور تاریخ

مورخ اور ادیب دونوں اپنے نقطہ نظر سے اپنے عہد کا مطالعہ کرتے ہوئے انسانی ذہن اور اس کی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ناول نگار جب اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے تو اس مقصد کے لئے وہ اپنے کردار خود تخلیق کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے کرداروں کو کیا کرنا ہے۔ وہ ان کے ذریعہ معاشرہ کے ذہن اور وقت کے تقاضوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مورخ جب ماضی کے بارے میں لکھتا ہے تو وہ حقائق اور دستاویزات کے مواد تک محدود ہوتا ہے اور یہ اس کی طاقت سے باہر ہوتا ہے کہ وہ حقائق کو بدل سکے اور تاریخی کرداروں کو اپنی مرضی سے ڈھال سکے۔ اس لئے ادیب کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے تخیل کو استعمال کر کے جس طرح سے چاہے کرداروں کو ڈھال لے اور ان کی روح کی تہوں تک پہنچ کر ان کے جذبات و احساسات کو ظاہر کر سکے۔ مورخ کی مجبوری یہ ہے کہ وہ حقائق کی موجودگی میں اپنے تخیل کو استعمال نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس کے تاریخی کردار ایک دائرہ میں مقید رہتے ہوئے اپنے رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے کرداروں میں دلکشی اور جاذبیت ہوتی ہے' وہ زندہ اور احساسات سے بھرپور نظر آتے ہیں' جب کہ تاریخ میں یہ کردار جامد اور ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

مشہور ناول نگار لیوٹالسٹائی (1910ء-1828ء) نے جنگ و امن کے عنوان سے جو ناول لکھا ہے اگرچہ اسے تاریخی ناول تو نہیں کہا جا سکتا ہے' مگر اس ناول میں اس نے اس صورت حال کو بیان کیا ہے کہ جو نپولین کے روس پر حملہ کے وقت تھی۔ ایک معاشرہ زمانہ امن میں کس طرح سے تھا اور جب جنگ ہوتی ہے تو یہی معاشرہ اور اس کے افراد کس طرح سے ایک نئی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں' اس ناول میں جگہ جگہ ٹالسٹائی تاریخ کے

بارے میں اپنے نظریات کو بیان کرتا جاتا ہے۔ اس ناول اور ان نظریات کی بنیاد پر برلن نے بھی اپنے ایک مضمون "The Hedgehog and Fox" میں ٹالسٹائی کے نظریہ تاریخ کو بیان کیا ہے۔

ٹالسٹائی کے اپنے زمانہ میں تاریخ کے بارے میں نئے نئے نظریات آ چکے تھے' جن میں ایک اہم نظریہ یہ تھا کہ تاریخ کو تشکیل دینے میں صرف شخصیات اہم رول ادا کرتی ہیں اور ہر شخصیت تاریخ ساز ہوتی ہے' اس لئے تاریخ میں سوائے ان شخصیتوں کے اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوتی ہے۔ ابتداء میں یہ عظیم شخصیتیں بادشاہوں' وزراء اور جنرلوں کی ہوا کرتی تھیں' مگر بعد میں ان میں علماء و مفکرین اور شاعروں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس نظریہ کے برعکس کچھ مورخوں نے 18 ویں صدی میں نو آبادیاتی نظام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل دی کہ دنیا کی تاریخ میں یورپی اقوام کا ایک عظیم مقصد ہے اور یہ مقصد آزادی' مساوات' اور یورپی تہذیب کا غلبہ ہے۔ ٹالسٹائی ان سب تاریخی نظریات کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تاریخ کا دائرہ اس قدر محدود نہیں ہے' بلکہ یہ وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور یہ مورخ کا کام ہے کہ وہ تاریخ کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے واقعات کو صرف سطحی طور پر نہیں دیکھے بلکہ ان کی گہرائی میں جائے۔ اکثر مورخ صرف سطحی واقعات کو دیکھتے ہیں' یہ اسی طرح سے ہے کہ جیسے کی درخت کے پتے ہمیں اس کی جڑوں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش لگتے ہیں' مگر درخت کی زندگی اور بنیاد پتوں میں نہیں بلکہ جڑوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تاریخی واقعات کی وجوہات کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ تاریخ محض ترتیب وار واقعات کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی' مگر اس کے ذریعہ کوئی سبق حاصل نہیں کیا جا سکے گا' کیونکہ تاریخ میں یہ سوالات انتہائی اہم ہیں کہ آون دی ٹیریبل' جو ایک نیک اور پاکباز انسان تھا' آخر کیوں' ظالم اور خون خوار ہو گیا؟ اس طرح یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ فرانسیسی انقلاب کے بعد جو تحریک اٹھی اور بالاخر یہ ماسکو تک پہنچی' مگر اس عمل میں پورے یورپ میں قتل و غارت گری ہوئی۔ کھیتیاں اجڑیں' مکانات جلائے گئے' تجارتی راستے بند ہو گئے' ہزارہا لوگ بے گھر ہوئے اور حالات کے تحت مجبور ہوئے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر جائیں' اس بحران میں ان عیسائیوں نے کہ جو عدم تشدد اور امن کے حامی سمجھے جاتے تھے' انہوں نے ہی اپنے ہم مذہبوں کا قتل کیا' تو آخر یہ

سب کیوں ہوا؟ کیا وجہ تھی کہ لوگوں کے گھروں کو آگ لگائی گئی' ساتھیوں کو قتل کیا گیا' اور تباہی و بربادی پھیلائی گئی۔ ان سوالات کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے' مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا نقطہ نظر ہے جو ان سوالات کا جواب تلاش کرتا ہے۔ کیونکہ اگر تاریخ کو مذہبی اور الٰہی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو خدا نے نپولین کو قہرالٰہی کی شکل میں بھیجا اور اس نے خدا کے منصوبوں کی تکمیل کی' یہ تاریخ کا اتنا سادہ اور سہل عمل ہے کہ اس میں کسی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے۔

تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے اہم سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ کون سی قوت ہے کہ جو لوگوں کو حرکت پر مجبور کرتی ہے؟ اس کا جواب اکثر مورخ یہ دیتے ہیں کہ تاریخی عمل میں حرکت کی یہ قوت کسی عظیم شخصیت یا نظریہ میں ہوتی ہے۔ تاریخ میں فرد کے کردار کو بیان کرتے ہوئے یہ دقت پیش آتی ہے کہ اگر مورخوں کا تعلق مختلف قوموں سے ہوتا ہے تو وہ ایک ہی واقعہ کو اپنی پسندیدہ شخصیت سے منسوب کر دیتے ہیں' جیسے فرانسیسی مورخ کے لئے نپولین تاریخ ساز شخصیت تھا' تو روسی مورخ کے لئے الگزنڈر' جرمنی کا مورخ اپنی کسی شخصیت کو چن لے گا۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قوم کے مورخ واقعات کو علیحدہ علیحدہ نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً تیر (Thiers) نپولین کو ذہین اور بلند و بالا شخص کے طور پر دیکھتا ہے مگر دوسرا مورخ جو جمہوری اقدار پر یقین رکھتا ہے اس کے لئے نپولین ایک دھوکہ باز اور فریبی تھا۔ مورخ ان متضاد بیانات کی وجہ سے اس قوت کی نشان دہی نہیں کر سکتے ہیں کہ جو قوموں کو متحرک رکھتی ہے' اور یوں تاریخ اہم سوالات کا جواب دینے سے گریز کرتی ہے۔

ٹالسٹائی اس بحث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تاریخ ایک محدود علم ہے' یہ سیاسی' معاشی اور سماجی پہلوؤں کو تو بیان کرتی ہے' مگر انسان کی روحانی اور باطنی زندگی اس کی گرفت سے باہر رہتی ہے' اس طرح تاریخ انسان کی زندگی کے بہت ہی مختصر حصہ کو اپنے دائرہ کار میں لاتی ہے۔

ٹالسٹائی تاریخ میں عظیم افراد اور ان کے کردار کی نفی کرتا ہے۔ اس کی دلیل ہے کہ تاریخ میں وہی لوگ مفید کام سرانجام دیتے ہیں کہ جو تاریخی عمل سے بے خبر ہو کر کچھ کرتے ہیں۔ مگر وہ افراد جو تاریخی تقاضوں سے مجبور ہو کر کچھ کرتے ہیں' ان کے کام

لاحاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا یہ دعویٰ کہ وہ انسانی فطرت کو سمجھتا ہے اور منصوبہ بندی کے ذریعہ انسانوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے' دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسا شخص خود ہی بدنصیبی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال نپولین کی ہے' جس نے یہ تاثر دیا کہ وہ سب کچھ سمجھتا ہے' اور اس میں اتنی ذہنی صلاحیت ہے کہ وہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے' اور تاریخی عمل سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں' وہ انہیں بخوبی حل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ آخر میں نپولین قابل رحم شخصیت بن گیا اور حالات نے جو ایک عظیم المیہ پیدا کیا' اس کا سب سے بڑا المیہ وہ خود ہو گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ وہ افراد جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تاریخ ساز ہیں۔ اور تاریخی عمل کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف کھوکھلے ہوتے ہیں۔ بلکہ خودفریبی کا شکار بھی ہوتے ہیں' اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ بے مقصدیت پیدا کر کے' حقیقت سے دور رہتے ہیں۔

اس لئے عظیم افراد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ معمولی اور ناواقف لوگ ہوتے ہیں۔ جو ساری ذمہ داریوں کو سنبھال لینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر خود اپنی بے وقعتی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ بڑا آدمی یا فرد اس جانور کی طرح ہوتا ہے کہ جسے ذبح کرنے کے لئے یا قربانی کے لئے تیار کر کے فربہ کیا جاتا ہے۔ اس کے گلے میں جو گھنٹی ہوتی ہے اس کے بجنے سے وہ سمجھتا ہے کہ پورا ریوڑ اس کی آواز پر حرکت کرتا ہے اور وہ ان کا لیڈر ہے۔ مگر اس کا اصل کردار راہنمائی اور لیڈری کا نہیں ہوتا ہے' بلکہ قربانی کا ہوتا ہے' مگر یہ عظیم افراد اس راز کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے اور آخر میں وہ قربان گاہ تک پہنچ کر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ٹالسٹائی کے نزدیک انسان کی شخصیت بڑی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے' اور یہ بڑا مشکل ہے کہ اس کی شخصیت کو کسی قانون یا ضابطہ کے تحت لایا جا سکے' یا اسے کسی ایک نقطہ نظر کے تحت بیان کیا جا سکے۔

ٹالسٹائی نے تاریخ کی جس کم مائیگی کی طرف اشارہ کیا ہے' اس میں حقیقت ہے۔ مگر بیسویں صدی میں تاریخ نے اپنے دائرہ کو وسیع کیا ہے' اور اس کوشش میں ہے کہ وہ انسان کے کردار' اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات' اس کے جذبات و احساسات کو بھی واقعات کے

حوالے سے دیکھے۔ اس میں تاریخ دوسرے سماجی علوم سے مدد لے رہی ہے' اور ان کی مدد سے افراد' معاشروں' اور قوموں کی تاریخ کو نئے انداز میں دیکھ رہی ہے۔ اسی لئے اب تاریخ محض سیاسی واقعات کا مجموعہ نہیں رہی ہے' بلکہ اس میں سماجی و ثقافتی اور نفسیاتی پہلو بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نئی تاریخ سے انسانی ذہن اور انسانی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ ٹالسٹائی نے جو سوالات اٹھائے ہیں۔ تاریخ ان کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہے۔ وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ لوگ پرامن شہری کے بجائے پر تشدد ہو جاتے ہیں؟ کن حالات میں نسلی' لسانی اور مذہبی ثقافت ابھرتی ہے؟ افراد اور لوگوں کے مفادات کبھی ان کو محب وطن بنا دیتے ہیں' تو کبھی وہ بالکل بے حس ہو جاتے ہیں' جب سے قوموں میں جمہوری روایات کے تحت سیاسی و سماجی شعور آیا ہے' اس کے ساتھ ہی ان کے کردار میں بھی تبدیلی آئی ہے اور تاریخی عمل میں ان کی شرکت بڑھ گئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ عظیم افراد کی قوت بھی گھٹ گئی ہے۔

تاریخ پر ٹالسٹائی کے ان خیالات کی اس لئے اہمیت ہے کہ وہ ایک ادیب بھی ہے اور اس کی قوت متخیلہ اس قدر گہری ہے کہ وہ انسانی کرداروں کی روح میں داخل ہو کر ان کے احساسات و جذبات کو جانچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ادب اور تاریخ کو جب ملا کر خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اس میں ایک نئی توانائی اور تراوٹ ہوتی ہے۔ اس کے ہاں بھی بہت سے سوالات بغیر جواب کے رہ جاتے ہیں' مگر یہ ضروری ہے کہ قاری خود بھی اپنے ذہن کو استعمال کرکے ان سوالات کا جواب ڈھونڈے تاکہ سچ کی تلاش میں وہ بھی برابر کا شریک ہو۔

عوامی تاریخ

اب تک ان ہی طبقوں کی تاریخ لکھی گئی ہے کہ جن کے پاس طاقت' قوت' اقتدار اور معاشی ذرائع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں حکمرانوں' امراء' اور مذہبی راہنماؤں کے تذکرے ہیں۔ ان طبقوں نے تاریخ کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا' اور طبقاتی فرق اور تقسیم کو صحیح و جائز قرار دیتے ہوئے تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ صرف اعلیٰ' شریف' اور اونچی ذات کے لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ حکومت کریں۔

عام لوگوں میں اپنے اثر و رسوخ کو مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے تاریخ میں اپنے کارناموں کو محفوظ کرایا' خاص طور سے اپنی بہادری' ہمت' اور جنگی خوبیوں کو' تاکہ لوگوں پر ان کا رعب و دبدبہ قائم رہے اور وہ خود کو ان سے کم تر سمجھ کر ان کی عزت و احترام کریں۔

حکمراں طبقوں میں ہمیشہ اور ابدی طور پر زندہ رہنے کی خواہش اس لئے ابھری کیونکہ ایک مرتبہ جب ان کے پاس طاقت و قوت اور مراعات آگئیں تو وہ کسی صورت میں ان سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے تاریخ میں وہ خود کو اپنے خاندان کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی ان کی یاد باقی رہے اور ان کا نام لوگوں کے دلوں میں' ان کی خوبیوں کی وجہ سے زندہ رہے۔ تاریخ نے ان کی ان خواہشات کو پورا کیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مورخوں کی خدمات حاصل کیں اور یوں تاریخ پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔

تاریخ پر ان کی اجارہ داری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے محروم' اور استحصالی طبقے غائب ہو گئے' اس طرح جیسے کہ ان کا تاریخ میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد تاریخ کی وضاحت یوں کی گئی کہ اس میں ان ہی واقعات کو شامل کیا جاتا ہے' یا ان کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جنھوں نے کوئی زبردست تبدیلی کی ہو۔ اس نقطہ نظر کے تحت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

کون سے واقعات اہم ہوتے ہیں؟ کیا جنگ و جدل' بادشاہوں کی تخت نشینی' انتظامی اصطلاحات' سیاسی سازشیں وہ انتقامی کاروائیاں' جوڑ توڑ اور معاشی ذرائع کا استحصال' یا وہ نظریات کے جو خاموشی سے ذہنوں کو بدل رہے ہیں' یا وہ سائنسی و فنی ایجادات کو جو بنیادی تبدیلیوں کے ذریعہ معاشرے کی اخلاقی و معاشی اور سماجی قدروں کو نئی شکل دے رہی ہیں؟

تاریخ میں اب تک سیاسی واقعات اور ان کے نتیجہ میں ہونے والی تبدیلیوں پر زور دیا گیا ہے' مگر نظریاتی اور فنی ایجادات نے جو اثرات پیدا کئے ہیں' ان کے بارے میں تاریخ کم ہی بتاتی ہے۔ اگر اہمیت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو نئی سائنسی و فنی ایجادات نے انسان کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ مثلاً صرف پہیہ کی ایجاد اور اس کے اثرات پر غور کیجئے کہ اس نے انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ صنعتی دور میں ایجادات نے معاشرے کے بنیادی ڈھانچہ کو بدل کر رکھ دیا۔ آج یہ ایجادات بڑی معمولی نظر آتی ہیں۔ مگر ذرا انہیں تاریخی پس منظر میں دیکھئے اور پھر ان کی اہمیت کا اندازہ لگایئے۔ اور پھر خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام ابتدائی ایجادات عام لوگوں کے تجربات اور ذہن کی پیداوار ہیں۔ مثلاً جیمز واٹ لوہار تھا۔ بارگریوز حجام تھا۔ چارلس پارسن' ٹربائن کا موجد' مستری تھا۔ صنعتی انقلاب میں ان ہی عام کارکنوں اور مستریوں نے حصہ لیا اور اپنی ایجادات سے اس عمل کو آگے بڑھایا۔

یہی صورت حال نظریات و افکار کی ہے کہ جو معاشرے میں ذہنی تبدیلی لاتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے قدیم و فرسودہ روایات کہ جو معاشرے کو ایک جگہ ٹھہرائے ہوئے ہوتی ہیں۔ وہ ٹوٹتی ہیں' اور معاشرہ نئی روایات کی بنیاد پر تشکیل ہوتا ہے۔ جب فرسودگی ختم ہوتی ہے' تو گھٹن بھی دور ہوتی ہے' اور اسی کے بعد ذہن نئی توانائی سے کام کرتا ہے۔

ایک زمانہ تک تاریخ کو اس طرح سے لکھا جاتا رہا کہ اس میں نظریات' سائنسی و فنی ایجادات کی اہمیت کو اجاگر نہیں کیا گیا اور اس کے دائرہ میں صرف حکمراں طبقوں کی تعریف و توصیف رہی۔ اسی وجہ سے تاریخ میں شخصیتوں کی اہمیت ابھری' اور اس نقطہ نظر کو ابھارا گیا کہ شخصیتیں ہی تاریخ ساز ہوتی ہیں اور عوام محض خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے معاشی و سیاسی حالات بدلتے گئے اور طاقت و قوت کی تقسیم ہوتی گئی' اسی طرح سے تاریخ کا دائرہ بھی بڑھتا رہا۔

چنانچہ جب جمہوریت کے بعد عوام کو اقتدار میں شریک ہونے اور حصہ لینے کا موقع ملا تو اس کے ساتھ مورخوں میں عوام کی اہمیت اجاگر ہوتی گئی۔ جمہوریت کے ساتھ دوسرا اہم عنصر قومی ریاست کی تشکیل کا تھا۔ قومی ریاست کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لئے ایک قوم کی تعمیر پر زور دیا گیا۔ لہٰذا اس بات کی کوشش ہوئی کہ قوم کی تشکیل میں تمام طبقوں کو شامل کیا جائے اور قومی ریاست کے دفاع کے لئے عوام میں وفاداری کے جذبات کو پیدا کیا جائے۔ لہٰذا جمہوری و قومی بنیادوں پر قائم معاشروں میں تاریخ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اس نئی تحقیق کے ذریعہ اس بات پر زور دیا گیا کہ تاریخ محض سیاسی واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں سماجی و معاشی اور ثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اب تک سیاسی واقعات کو متحرک' جاندار' اور طاقتور سمجھا جاتا تھا اور ان کے مقابلہ میں سماجی و ثقافتی' روایات خاموش اور ساکت تھیں۔ مگر جب ان کی تہہ میں جا کر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا تو یہ سنسنی خیز واقعات سے زیادہ پر اثر تھے۔ اسی لئے اب تاریخ نویسی میں ثقافتی سرگرمیوں کی زیادہ اہمیت ہو رہی ہے اور سیاسی واقعات پس پردہ جا رہے ہیں۔ نقطہ نظر کی اس تبدیلی کی وجہ سے تاریخ میں عوام کا کردار ابھر کر آ رہا ہے۔

چنانچہ تاریخ نویسی میں یہ رجحان آیا کہ لوگوں کی تاریخ لکھی جائے جیسے "انگلستان کے عوام کی تاریخ" یا "فرانس کے عوام کی تاریخ" اس خیال کو رد کرنے کے لئے کہ عوام کا تاریخ میں کوئی کردار نہیں ہوتا ہے' ہندوستان کے کچھ مورخوں نے "سبالٹرن اسٹڈی" کے نام سے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد ڈالی ہے تاکہ تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کریں کہ جنہیں اب تک تاریخ نے نظرانداز کر دیا ہے اسی لئے جب ان کا گہرائی سے تجزیہ کیا گیا تو ان کے معاشرے پر اثرات ابھر کر سامنے آئے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں ایسی کوئی تاریخ لکھی گئی ہے کہ جسے لوگوں کی تاریخ کہا جا سکے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ 1947ء سے لے کر اب تک جو تاریخ لکھی گئی ہے اس میں مورخوں نے تمام زور نظریاتی تاریخ پر دیا ہے۔ جس میں دو قومی نظریہ کا دفاع کیا ہے۔ لہٰذا' اس ضمن میں تاریخ میں صرف شخصیتیں سرگرم عمل نظر آتی ہیں' پاکستان تحریک شخصیتوں کی پیداوار ہے اور ان ہی کی وجہ سے کامیاب ہوئی ہے۔ اس عمل

ں لوگ غائب نظر آتے ہیں۔

اگر عوام کے نقطہ نظر سے اس تحریک کا جائزہ لیا جائے تو بہت سی اہم باتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ نگہت سعید خاں نے اپنے ایک مضمون میں سندھ اور پنجاب کی ان عورتوں سے انٹرویو کئے کہ جو ہجرت کر کے پاکستان آئیں۔ ان میں سے اکثریت کو نہ تو مسلم لیگ کے بارے میں کچھ پتہ تھا' نہ لاہور ریزرویشن کے بارے میں' اور نہ ہی محمد علی جناح کے ے میں۔ ان کے نزدیک پاکستانی تحریک فرقہ وارانہ فسادات' قتل و غارت گری' لوٹ مار' ھربار کا اجڑنا' اور ہجرت کر کے آنا تھا۔ تقسیم کے بارے میں ان کی یہی یادیں ہیں۔ نہ وہ سی دو قومی نظریہ سے واقف ہیں' نہ اقبال کے خواب سے' اور نہ جناح کے 14 نکات ے۔

اس لئے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تقسیم میں لوگوں نے حصہ لیا' یا یہ چند صیتوں اور گروہوں کا منصوبہ تھا کہ جو لوگوں کی مرضی کے بغیر عمل میں آیا؟ ان لوگوں نے کہ جنھوں نے تقسیم کے عمل کو دیکھا ہے' اس میں حصہ لیا ہے' اور اس سے متاثر ئے ہیں' ان کے خیالات کو رقم بند کیا جائے تو تحریک پاکستان کی تاریخ جو اب تک ے سامنے ہے' اس میں زبردست تبدیلی آئے گی اور یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم ان ت کی بنیاد پر پاکستان کی تشکیل نو کر سکیں۔

پاکستان کی اس مختصر تاریخ کو نہ صرف پاکستانی مورخوں بلکہ غیر ملکی مورخوں نے بھی رانوں کی شخصیت کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ کتابوں کے موضوعات اس قسم کے ہیں ناح آف پاکستان" یا "بھٹو آف پاکستان" یا "پاکستان انڈر ایوب خاں" یا "پاکستان انڈر الحق" اس سے ذہن میں جو خیال ابھرتا ہے کہ یہ وہ شخصیتیں ہیں کہ جن کی جاگیر ان تھا' چونکہ جب ہم "نواب آف کالا باغ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو مطلب ا ہے کہ کالا باغ کے جاگیردار۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان شخصیتوں نے یت اور عوام کو نظر انداز کرتے ہوئے آمرانہ طریقوں سے حکومت کی' ملک کو جاگیر اور عوام کو اپنے مزارع۔

پاکستان میں تاریخ نویسی کا تعلق ملک کے سیاسی حالات سے رہا ہے۔ چونکہ یہاں طویل ۔ آمریت و فوج کی حکومت رہی' اس لئے مورخ عوام کو نظر انداز کر کے صرف ان کی

تعریف و توصیف کرتے رہے۔ جب آمریت کے بعد جمہوریت آتی ہے تو جنرلوں کی جگہ اس ملک کے زمیندار اور جاگیردار لے لیتے ہیں اور وہ اپنے خاندان کے بزرگوں کے کارنامے لکھوا کر خود کو ان کا جائز وارث ثابت کراتے ہیں۔

تاریخ میں کسی شخص، گروہ، یا جماعت کا موجود ہونا انتہائی اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس بنیاد پر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اپنی حکمرانی کی حیثیت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ تاریخ سے غیر حاضر ہیں، ان کے لئے اپنی حیثیت تسلیم کرانے کے لئے کوئی تاریخی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں یہ دیتا ہوں کہ جب تاریخ میں یہ بتایا جائے کہ عورتیں ہمیشہ سے گھروں میں رہی ہیں، گھریلو کام کاج کا شعبہ رہا ہے۔ ان کے اہم فرائض میں بچے پیدا کرنا اور ان کی تربیت رہی ہے۔ تو اس تاریخ کے بیان سے یہ نظریہ قوی ہو گا کہ آج بھی عورتوں کو اسی طرح سے رہنا چاہئے، کیونکہ ماضی میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، اس میں تبدیلی کا مطلب معاشرے کے توازن کو بگاڑنا ہے۔ اس لئے اگر صرف حکمرانوں اور شخصیتوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس سے یہی تاثر ہو گا کہ حکومت کرنے کا حق انہیں کو ہے، عوام کا کام ان کی اطاعت ہے۔ کیونکہ تاریخ میں حکمراں حاضر و سرگرم ہوتے ہیں، جب کہ عوام خاموش و غیر حاضر۔

اگر عوام کی تاریخ لکھی جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان عوامل کا تجزیہ کیا جائے کہ جو تاریخ کو تشکیل دیتے ہیں۔ عوام کی زندگی میں سطحی طور پر شاید ایک مورخ کو کوئی زیادہ تاریخی مواد نظر نہیں آئے گا، کیونکہ یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، محنت و مزدوری کر کے روزی پیدا کرتے ہیں۔ دستکار و ہنرمند آلات و اوزار بناتے ہیں۔ معمار مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ مزدور فیکٹریوں میں ضرورت کی اشیاء پیدا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ روزمرہ کی سرگرمیاں ہیں، جن کا مشاہدہ کیا جائے تو ان میں کوئی سنسنی خیز بات نہیں ملے گی۔ مگر ذرا اس کی تہہ میں جائیں تو معلوم ہو گا کہ انہیں سرگرمیوں کی وجہ سے ملک کی معیشت چلتی ہے۔ ان ہی کی کمائی سے ریاست کے ادارے بنتے ہیں۔ اور ان ہی کی محنت کے نتیجہ میں ثقافت تشکیل ہوتی ہے۔ اس تمام عمل کے آخر میں وہ تمام ذرائع سے محروم ہو جاتے ہیں، جب کہ حکمراں طبقے ان کی دولت پر قبضہ کر کے ان پر حکومت کرتے ہیں۔

پاکستان کی تاریخ میں اس کو بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ لوگ جو دولت پیدا کرتے ہیں اور جس پر حکمراں طبقے قبضہ کرتے ہیں' اس کا استعمال کہاں ہوتا ہے؟ کیا ان سے اسکول' ہسپتال بنتے ہیں' اور شہری و دیہاتی سہولتیں دی جاتی ہیں' یا یہ دولت حکمرانوں کی عیاشی میں استعمال ہوتی ہے۔ اس دولت کا اکثر حصہ فوج کے لئے اسلحہ خریدنے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا بیمار و مفلس' فاقہ زدہ عوام کو صحت و تعلیم کی ضرورت ہے یا ایف 16 اور سب میرین کی؟

1947ء سے حکمراں طبقوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ عوام کو تاریخی عمل سے دور رکھا جائے۔ انہیں ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے کہ وہ اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں اس لئے جمہوری اداروں کو ابھرنے نہیں دیا گیا۔ آمریت و فوج کے ذریعہ لوگوں کو دبا کر رکھا گیا۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں نے وقتاً" فوقتاً" ان کے خلاف آواز اٹھائی' ایوب خان کا زوال لوگوں کے مظاہروں کے نتیجہ میں ہی ہوا' بھٹو کی پالیسیوں کے خلاف بھی عوام نے آواز اٹھائی' ایم۔ آر۔ ڈی' کی تحریک بھی لوگوں کی چلائی ہوئی تھی۔ یہ وہ موضوعات ہیں کہ جو عوام کی تاریخ کے دائرہ میں آتے ہیں۔

لیکن عوام کی تاریخ صرف اسی وقت لکھی جا سکتی ہے کہ جب عوام کے پاس قوت و طاقت ہو گی۔ دوسرے اگر کوئی عوام کی تاریخ لکھے بھی' تو عوام کو اس سے اس وقت فائدہ ہو گا کہ جب وہ اسے پڑھ سکیں اور اپنے بارے میں آگاہ ہو سکیں۔ اگر عوام کو جاہل رکھا گیا' تو انہیں اس کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ اپنے رول کے بارے میں واقف ہو سکیں کہ جو تاریخ میں انہوں نے ادا کیا ہے۔ اس واقفیت کے بغیر ان میں تاریخی تصور کی کمی رہے گی۔

امریکہ اور کالوں کی تاریخ

اکثر مورخ قومی تاریخ لکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان ہی واقعات کا ذکر کیا جائے کہ جن سے قوم اور افراد کی شان و شوکت ظاہر ہو اور ان واقعات کو نظرانداز کر دیا جائے کہ جن سے بدنامی اور شہرت کو خطرہ ہو۔ اس قسم کی کوشش امریکہ کی تاریخ نویسی میں ہوئی کہ جس میں غلامی کے ادارے اور اس کے بارے میں یا تو خاموشی اختیار کی گئی اور یا پھر اس کا اخلاقی جواز پیش کیا گیا۔

لیکن تاریخ نویسی کے اندر اب انقلابی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور وہ جماعتیں اور گروپس کہ جنہیں مورخوں نے تاریخ میں نظرانداز کر دیا تھا' وقت کے ساتھ جب ان میں تعلیم اور شعور آیا تو انہوں نے خود اپنی تاریخیں لکھنی شروع کر دیں اور اس طرح کوشش کی کہ تاریخ میں اپنے کردار کا تعین کریں۔ مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں اچھوت لوگوں کا کوئی قابل عزت درجہ نہیں' مگر اب اچھوت لوگ اپنی تاریخ کی خود تشکیل کر رہے ہیں۔ اور اس کے محتاج نہیں کہ کوئی دوسرا ان کی تاریخ لکھے۔

یہی صورت حال امریکہ میں افریقی غلاموں کی تھی کہ جن کی تاریخ اب تک سفید فام مورخوں نے لکھی تھی اور ان کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا تھا۔ مگر اب افریقی لوگ خود اپنے نقطہ نظر سے اپنی تاریخ کو لکھ رہے ہیں اور اپنی شناخت کو ابھار رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں الیکس ہیلی کا ناول "روٹس" قابل ذکر ہے کہ جو فکشن ہے مگر اس میں اس نے غلامی کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے اور اس کا بیان کرنے والا ایک افریقی ہے جو صدیوں کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے کہ جس میں افریقیوں کو افریقہ سے لایا جاتا ہے غلام بنایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ غیرانسانی برتاؤ کیا جاتا ہے۔

اس لئے جب موجودہ نقطہ نظر سے غلامی کا ادارہ انسانیت کے خلاف اور غیراخلاقی ٹھہرا تو اس صورت میں امریکی مورخوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی تاریخ

میں غلامی کے ادارے کے وجود کو کسی طرح سے صحیح ثابت کرے۔ چنانچہ امریکی مورخ تاریخ کی نئی تشکیل دیتے ہوئے غلامی کے بارے میں مختلف دلائل استعمال کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ غلامی کا ادارہ جنگی قیدیوں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ اس سے پہلے جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا، مگر جب ان کو غلام بنایا جانے لگا تو اس کی وجہ سے ان کی جانیں بچ گئیں، لہٰذا اس ادارے نے قتل عام کو روکا اور جنگی قیدیوں کو زندگی دی۔ اس بنیاد پر کہ جنگی قیدیوں کو غلامی نے نئی زندگی دی، ان کو معاشرہ میں غلام بنا کر رکھنا اخلاقی طور پر صحیح تھا۔

ایک امریکی مورخ جارج بان کروفٹ (George Ban Croft) نے امریکی تاریخ لکھتے ہوئے غلامی کے ادارے کی تاریخ یونان اور روم سے شروع کی اور دلیل دی کہ امریکی اس کے بانی نہ تھے بلکہ یہ ادارہ پہلے سے موجود تھا اور انہوں نے صرف اسے اختیار کیا۔

غلامی کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ معاشرے میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ تاریخ کے علاوہ یہ نقطہ نظر مشہور امریکی ناول "گان وِتھ دی ونڈ" میں بھی ہے۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ کیا ان غلاموں نے کوئی ایسا کام کیا کہ جو تاریخ کا حصہ بنتا۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ یہ غلام تھے اور مکمل طور پر اپنے آقا اور مالک کے تابع تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی کلچر پیدا نہیں کیا۔ تاریخ بنانے میں ان کے آقاؤں کا حصہ تھا اس لئے تاریخ میں انہیں کا ذکر آتا ہے کہ جو متحرک اور باعمل ہوتا ہے۔ غلام تاریخ سے اس لئے باہر ہیں کہ ان کی اپنی کوئی شخصیت تھی ہی نہیں۔

اکثر مورخ جب غلاموں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ امریکہ میں غلاموں کو لایا گیا یا بدقسمتی ہے کہ غلامی کا معاشرہ قائم ہوا۔ اس کے پس منظر میں جو ذہنیت کام کرتی ہے وہ یہ کہ اگر یہ غلام نہیں ہوتے تو امریکی معاشرہ خالص اور پاکیزہ ہوتا۔ یہ المیہ ہے کہ اس نے معاشرہ کو آلودہ کر دیا۔

سفید فام تاریخ نویسی کے جواب میں سیاہ فام مورخوں نے اپنی تاریخ کی تشکیل کرتے ہوئے ان دلائل کو رد کیا ہے۔ اول تو انہوں نے غلامی کے ادارے اور غلاموں کی سرگرمیوں کو تاریخ کے دھارے میں شریک کیا۔ ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ افریقی غلاموں کی

تاریخ علیحدہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اسے علیحدہ کر دیا گیا تو اس صورت میں سفید فام آقاؤں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ پوشیدہ رہے گا۔ افریقی غلاموں نے امریکہ کی تاریخ بنانے میں پورا پورا حصہ لیا ہے لہٰذا اس کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں وہ غلام کہ جو تاریخ میں گمنام تھے' دوبارہ سے زندہ ہو گئے اور تاریخی طور پر معاشرے میں ان کی سماجی اور معاشی اہمیت بڑھ گئی۔

انہوں نے اس نقطہ نظر کو بھی رد کیا ہے کہ غلام مالکوں کے تابع تھے اور اس طرح ان کی اپنی شخصیت نہ تھی۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ غلاموں نے ان حالات میں بھی اپنا کلچر تخلیق کیا۔ اور یہ کہ انہوں نے غلامی کو خاموشی سے قبول بھی نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف برابر مزاحمت جاری رکھی۔ انہوں نے اس بات کی بھی نشان دہی کی کہ سفید فام معاشرے کو غلامی کے ادارے کی اس لئے ضرورت تھی کیونکہ دوسری یورپی ملازم مستقل طور پر ایک ہی جگہ ملازمت کرنے پر اور اپنی محنت بیچنے پر تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کے تھوڑے بہت حقوق بھی تھے۔ اگر انہیں ملازم رکھا جاتا تو معاشرے میں طبقاتی تضادات بڑھتے اور سفید فام آقاؤں کا استحصال ابھر کر سامنے آتا۔ اس لئے افریقی غلاموں کو لایا گیا کہ جن کے کوئی حقوق نہیں تھے اور نہ ہی کوئی ادارہ یا قانون ان کی حمایت کے لئے تیار تھا۔ اس لئے نسلی طور پر ان کا استحصال ممکن تھا۔

اس لئے غلامی نے امریکی معاشرے میں نسلی تعصبات کو پیدا کیا۔ ان کی موجودگی کو سفید فاموں کے لئے بطور خطرہ پیش کرتے ہوئے انہیں نسلی بنیادوں پر متحد رکھا' جس کی وجہ سے سفید فام ملازم اور نچلے درجے کے لوگ بھی خود کو برتر سمجھنے لگے اور اس طرح انہوں نے اپنے مفادات سفید فام مالکوں سے ملا دیئے۔ طبقاتی تضادات نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں سماجی تبدیلی کے راستے بند ہو گئے۔

سیاہ فام مورخ اب ایک ایسی امریکی تاریخ کی تشکیل دے رہے ہیں کہ جس میں نسلی و طبقاتی تضادات کو ابھارا جائے اور ایک ایسی مشترک تاریخ کو بیان کیا جائے کہ جس میں غلاموں کا کردار پوری طرح سے ابھر کر آئے۔

پاکستان کی تاریخ کیسے لکھنی چاہئے؟

پاکستان نیشنل کمیشن آف ہسٹری اور کلچر کی جانب سے اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کی ایک مربوط تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ تاریخ سرکار کی سرپرستی میں لکھی جا رہی ہے' اس لئے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں' اور وہ سوالات یہ ہیں کہ اس تاریخ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا اس تاریخ کا خاکہ ان تاریخوں سے مختلف ہو گا کہ جو اب تک لکھی گئی ہیں؟ اگر ایسا ہو گا تو وہ کون سا فریم ورک ہو گا کہ جس میں یہ تاریخ لکھی جائے گی۔ کیا یہ تاریخ بھی دو قومی نظریہ کے تحت لکھی جائے گی یا اس سے علیحدہ اور مختلف نظریہ کی تشکیل کرے گی؟ کیا اس میں بھی تاریخ کو شخصیتوں کے گرد لکھا جائے گا؟ یا سماجی و سیاسی و معاشی عناصر کو اہمیت دی جائے گی۔ کیا اس میں مراعات یافتہ طبقوں کی تعریف و توصیف کی جائے گی؟ یا عام لوگوں کے کردار کو ابھارا جائے گا۔ کیا اس میں ہندو دشمنی کے جذبات کو برانگیختہ کیا جائے گا یا ان کے سماجی و ثقافتی رشتوں کو اجاگر کیا جائے گا۔ کیا اس کے ذریعہ لوگوں میں تاریخی شعور پیدا کیا جائے گا کہ وہ اپنے حقوق کے لئے لڑیں؟ یا اس کے ذریعہ عوام میں فرمان برداری کے کلچر کو پیدا کیا جائے گا۔ کیا اس میں مذہبی و لسانی و ثقافتی اقلیتوں کے کام اور کردار کو شامل کیا جائے گا؟ یا انہیں قومی دھارے سے علیحدہ کر کے اچھوت بنایا جا سکے گا؟ یہ اور اس قسم کے سوالات ہیں کہ جو کمیشن کو اپنے سامنے رکھنا ضروری ہیں۔

اس سے پہلے میں اپنی رائے دوں کہ پاکستان کی جدید تاریخ کو کیسے لکھنا چاہئے؟ میں مختصراً اس جانب اشارہ کرنا چاہوں گا کہ برصغیر ہندوستان کی تحریک آزادی کو کس کس طرح اور کن نقطہ ہائے نظر کے ساتھ لکھا جا رہا ہے؟ (میں یہاں صرف آزادی کی قومی تحریک تک خود کو محدود رکھوں گا۔)

سب سے اہم نقطہ نظر قوم پرستی کا ہے کہ جس کے تحت ہندوستان کی سامراج سے

قومی آزادی کو وسیع تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت قومی آزادی کی تحریک ہندوستانی کی مختلف اقوام' ذاتوں' اور جماعتوں کی ایک متحد تحریک تھی۔ اس میں ہر نظریہ کے رکھنے والے تھے چاہے وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے' مسلمان ہوں یا ہندو' تشدد پسند ہوں' یا عدم تشدد کے پیروکار' فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہوں یا وسیع المشرب۔ ان مختلف نظریات کو متحد رکھنے والا عنصر سامراج دشمنی تھا۔ تاکہ اس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جائے کہ جس میں سیکولر ازم' جمہوریت ہو' اور جہاں معاشرہ غیر ملکی سرمایہ سے آزاد ہو' قومی سرمایہ کی بنیاد پر صنعتی ترقی ہو۔ جہاں جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے کسانوں کو آزادی دی جائے۔ اور ایک ایسا نظام تشکیل دیا جائے کہ جس میں عوام کی فلاح و بہبود ہو۔

اس نقطہ نظر کے برعکس کیمبرج اسکول نے اپنی تحقیق سے جو نتائج نکالے ہیں' اس میں وہ برطانوی سامراج کی حمایت کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس اسکول کے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی حیثیت ایک غیر ملکی حکومت کی تھی۔ اس کا اپنا کوئی سیاسی' معاشی اور سماجی نظام نہیں تھا۔ اس لئے وہ اس پہلو کو نظرانداز کرتے ہیں کہ سامراجی نظام کی ٹوٹ پھوٹ سیاسی و معاشی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ برطانوی حکومت اور ہندوستان کے عوام کے درمیان کوئی تضاد نہیں تھا۔ اس لئے ہندوستان کی قومی تحریک اس تضاد کی وجہ سے نہیں ابھری' اور نہ یہ تحریک سامراج کے خلاف تھی۔

اس اسکول کے مورخوں نے اس سے انکار کیا ہے کہ ہندوستان میں کوئی ایک قوم تھی۔ اس کے برعکس وہ ہندوستانی معاشرہ کو مختلف ذاتوں' برادریوں' مذہبی و لسانی جماعتوں میں بٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تقسیم تھی کہ ان کو متحد کرنے والا کوئی عنصر نہیں تھا۔ اس لئے ہندوستان کی قومی تحریک آزادی کو ایک قوم کے تناظر میں دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کی شناخت ان کی ذات پات' مذہب' یا زبان پر تھی۔ اور اسی بنیاد پر ہندوستان میں سیاسی تحریکیں چلیں۔

ہندوستان کی قوم پرست تحریکیں دراصل طبقہ اعلیٰ (Elite) کے مفادات کے لئے تھیں۔ اس لئے ان تحریکوں سے ان طبقوں کے مفادات ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنے مفادات کو

پورا کرنے کے لئے انہوں نے قوم پرستی کے نام پر کبھی مذہبی جذبات کو ابھارا اور کبھی ذات پات کے نام پر لوگوں کو متحد کیا۔ ہندوستان کے بورژوا طبقہ نے برطانوی حکومت کی اس لئے مخالفت کی کیونکہ وہ ان کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس لئے قوم پرستی کی تحریکیں ان کے خودغرضانہ مفادات کے تحفظ کے لئے تھیں۔

کیمبرج اسکول کے مورخین نے بورژوا طبقوں کے باہمی تضادات اور اختلافات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان میں کچھ برطانوی حکومت کی حمایت کر کے اس سے فوائد حاصل کر رہے تھے تو کچھ مخالفت کر کے آئندہ کے لئے اپنی ترقی کی راہیں ہموار کر رہے تھے اس لئے ہندوستان کی سیاست میں طبقہ اعلیٰ کے لوگوں کی اجارہ داری رہی۔ کیونکہ اپنی طبقاتی پوزیشن کی وجہ سے ان کے ایسے اختیارات تھے کہ وہ اپنے حلقہ کے لوگوں کے کام کراتے تھے۔ اس لئے ان میں اور عوام میں سرپرست و درخواست گذار والا رشتہ تھا۔ اسی بنیاد پر انہوں نے معاشرہ میں اپنی سیاسی و سماجی برتری کو قائم رکھا۔

ہندوستانی تاریخ کو نچلے ہوئے محروم طبقوں کے نقطہ نظر سے لکھنے میں مورخوں کی ایک نئی جماعت ہے جو اپنے نقطہ نظر کو Subaltern کا نام دیتے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان کی جدید تاریخ کو لکھتے ہوئے، برطانوی دور حکومت میں اٹھنے والی تحریکوں کو طبقہ اعلیٰ اور حکومت کے درمیان تضادات کو قرار دیتے ہیں کہ جس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چونکہ ہندوستان کے عوام سامراج کے خلاف کبھی متحد نہیں ہوئے، اس لئے قومی تحریک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نچلے طبقوں میں سامراج کے خلاف جذبات تھے، مگر انہیں ان جذبات کے اظہار کے لئے مواقع نہیں ملے۔ جبکہ طبقہ اعلیٰ نے نام نہاد قوم پرستی کے نام پر ان جذبات کو استعمال کیا۔ اس لئے Subaltern مکتبہ فکر کے مورخ ان عوامی تحریکوں کو اجاگر کر رہے ہیں کہ جو تاریخ میں گمنام رہی ہیں۔

مارکسی مکتبہ فکر کے مورخین قومی آزادی کی تحریک کو طبقاتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے قومی تحریک کو ایک بورژوا تحریک قرار دیتے ہیں کہ جن کے لئے عدم تشدد ایک ایسی پالیسی تھی کہ جو ان کے مفادات کے لئے ضروری تھی۔

پاکستان میں آزادی کی تحریک کو دو قومی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے جس میں برصغیر کی تقسیم اس لئے ضروری تھی، کیونکہ دو قومیں ایک ملک میں رہتے ہوئے مساوی حقوق حاصل

نہیں کر سکتی تھیں۔ پاکستان میں تقسیم کے بعد بہت سے سوالات اٹھے : مثلاً یہ کہ کیا پاکستان مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا' یا اسلام کے لئے؟ کیا پاکستان کی تاریخ کو عربوں کی فتح سندھ سے شروع کیا جائے یا اس کی قدیم تاریخ کو بھی اس میں شامل کیا جائے؟ کیا پاکستان کی تاریخ کو ہندوستان کی تاریخ سے بالکل کاٹ دیا جائے اور اس پر صرف ان علاقوں کی تاریخ لکھی جائے کہ جو اس کا حصہ ہیں؟ کیا ہندوستان سے تمام ثقافتی سیاسی و سماجی رشتوں کو توڑ کر اس کے رشتے وسط ایشیا سے قائم کئے جائیں! یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں کہ جن کا جواب پاکستان کی تاریخ لکھنے سے پہلے ضروری ہے۔

آزادی کی تحریکوں میں قوم پرستی اور قومی مفاد کے نام پر تمام طبقوں کو متحد کیا جاتا ہے۔ اور ان کے جو تضادات ہوتے ہیں' ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں وقت آنے پر دور کر دیا جائے گا۔ یہی کچھ برصغیر کی قومی تحریکوں میں ہوا کہ جن کی بنیادیں سامراج کے خلاف تھیں۔ اس جنگ میں مظلوم و استحصالی طبقوں کو شامل کر کے تحریک کو مضبوط بنایا گیا۔ ان میں اقلیتیں بھی تھیں۔ اور عورتیں بھی' طالب علم اور مزدور و کسان بھی تھے۔ لیکن جب ملک آزاد ہوا تو اقتدار پر طبقہ اعلیٰ نے قبضہ کر لیا اور ان مظلوم طبقوں کو دوبارہ سے ان کے اصلی مقام پر بھیج دیا گیا۔ اور کہا گیا وہ سیاست سے دور رہیں اور ملک کے لئے قربانی دیں۔ اس وقت سے اس ملک کے مظلوم طبقے اس امید میں قربانیاں دے رہے ہیں کہ شاید وہ وقت آئے گا کہ جب انہیں ان کے حقوق ملیں گے اور انہیں عزت و وقار ملے گا۔

پاکستان کے عوام کی یہ امیدیں کیوں پوری نہیں ہوئیں! کیا نئی لکھی جانے والی تاریخ اس کا جواب دے گی؟

تاریخ کا کام یہ نہیں کہ وہ حکمراں طبقوں اور ان کے راہنماؤں کی غلطیوں' بدعنوانیوں' اور حماقتوں کی پردہ پوشی کرے بلکہ اسے پردہ پوشی کے بجائے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے نام پر جو طبقاتی مفادات کو پورا کیا گیا ہے' اس کو ظاہر کیا جائے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ قوم کے نام پر یہ صوبائی اور علاقائی شناختوں کو ختم کیا ہے' اسے ابھارا جائے۔ ان اقلیتوں اور مظلوم طبقوں کی قربانیوں کو تسلیم کیا جائے کہ جنہوں نے اس ملک کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا۔ اس لئے ایک ایسی تاریخ

لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس کی ابتداء صوبائی و علاقائی تاریخ سے ہو۔ پھر اس کی بنیاد پر ایک قومی تاریخ لکھی جائے۔ مگر یہ تاریخ کسی دو قومی نظریہ پر نہ ہو' بلکہ ایک قومی نظریہ پر ہو کہ جس میں اس ملک کے تمام رہنے والے شامل ہوں۔ اگر ایسی تاریخ لکھی گئی تو یہ ایک سیکولر اور جمہوری معاشرہ کی بنیاد بن سکے گی۔

(جسٹس اینڈ پیس کمیشن کے سیمنار میں پڑھا گیا۔ 30- مارچ 1996ء لاہور)

ہمارے نظام تعلیم کی بنیادیں

(1)

تعلیم کے سلسلہ میں ایک رجحان تو یہ رہا ہے کہ یہ صرف چند مخصوص طبقوں کے لئے ضروری ہے اس لئے اسے محدود رکھا جائے اور نچلے طبقوں سے دور رکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو معاشرے میں اچھوت لوگوں کے لئے تعلیم ممنوع تھی۔ بعض غلام معاشروں میں بھی غلاموں کے لئے تعلیم حاصل کرنا سختی سے منع تھا اور کچھ معاشروں میں یہ عورتوں کے لئے شجر ممنوعہ تھی۔ اس رجحان کے پس منظر میں یہ احساس تھا کہ تعلیم لوگوں کو باشعور بنائے گی اور اس سے قائم شدہ روایات کو خطرہ ہو گا۔ لٰہذا تعلیم کو محدود رکھ کر طبقہ اعلی کی برتری کو قائم رکھا جائے۔ 1670ء کی دہائی میں' اسی چیز اور اسی خطرے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ورجینیا کے گورنر ولیم برکلے نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں کوئی فری اسکول نہیں۔ چھپائی اور تعلیم نہیں۔ کیونکہ تعلیم تابعداری کو ختم کرتی ہے۔ اس سے کفر اور فرقے پیدا ہوتے ہیں۔"

تعلیم کے سلسلہ میں دوسرا رجحان یہ تھا کہ نچلے طبقوں' غلاموں اور عورتوں کو محدود تعلیم دی جائے تاکہ وہ انتظامی امور اور معاملات میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ تک عورتوں کی تعلیم کے بارے میں یہ رویہ تھا کہ یا تو انہیں تعلیم سے بالکل دور رکھا جائے۔ یا صرف اس قدر کہ وہ گھر کے کام کاج میں مددگار ہو سکے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اسی صدی میں بہشتی زیور میں عورتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "اگر لکھنا سکھایا بھی جائے تو صرف اس قدر کہ وہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکے' بس اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔"

بنیادی طور پر ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد یہ رہا ہے کہ اس کے ذریعہ اطاعت گزاری کا

کلچر پیدا کیا جائے۔ اسے فروغ دیا جائے اور پھر اسے مستحکم کیا جائے۔ اس لئے تعلیم اور نصاب تعلیم میں طبقاتی فرق کو ہمیشہ سے برقرار رکھا گیا ہے۔ مثلاً طبقہ اعلیٰ کو جو تعلیم و تربیت دی جاتی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں کیسے حکومت کرنی چاہئے؟ رعیت کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے؟ اور اپنی حکمرانی کی خصوصیات کو کیسے برقرار رکھنا چاہئے؟ اس مقصد کے لئے ان کے لئے جو نصاب تعلیم بنایا جاتا تھا۔ اس میں اہم کتابیں نظام الملک کی کتاب سیاست نامہ' قابوس کی قابوس نامہ' غزلی کی نصیحت الملوک اور اسی قسم کی دوسری کتابیں تھیں۔ ان میں نوجوان شہزادوں اور امراء کو تربیت دی جاتی تھی کہ وہ نشست و برخاست' بات چیت' جسم کی حرکات و سکنات' گفتگو' اور اپنے طرز عمل میں کس طرح سے خود کو عام لوگوں سے ممتاز کریں۔

خواص اور عوام میں فرق کو برقرار رکھنے کے لئے خصوصیت سے زبان پر توجہ دی جاتی تھی۔ صرف و نحو' قواعد اور فصاحت و بلاغت وہ اہم موضوعات تھے کہ جن کی تعلیم خواص کے لئے ضروری تھی۔ الفاظ کا تلفظ۔ ضرب الامثال و اشعار کا استعمال' اور جملوں کی ساخت وہ صفات تھیں کہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ کو ان پڑھ اور غیر مہذب عوام سے جدا کرتی تھیں۔ زبان کے استعمال سے پتہ چل جاتا تھا کہ بولنے والے کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔

امراؤ کے برعکس عام لوگوں کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا تھا اس کا مقصد تھا کہ ایک ایسا ذہن بنایا جائے کہ جو اطاعت گذاری اور تابعداری کی صفات رکھتا ہو۔ جو مروجہ روایات کو اٹل و آفاقی سمجھتے ہوئے انہیں تسلیم کرے' انہیں چیلنج کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے' جو صاحب اقتدار اور حکمراں طبقوں کی برتری کو مانے اور معاشرے کے طبقاتی نظام کا فطری ہونا قبول کرے۔ سعدی کی گلستان و بوستان۔ اخلاق محسنی' و اخلاق ناصری میں اسی قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان تعلیمی روایات نے ایک طویل عرصہ تک تقلید کی روایت کو مضبوط رکھا اور ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کیا کہ مصلحت و منافقت پرستی کے سہارے زندہ رہا اور جس نے خوشامد کے ذریعہ زندگی میں کامیابیاں حاصل کیں۔

پھر تعلیم کو پیشہ ورانہ تربیت اور مہارت سے بالکل جدا رکھا گیا۔ تعلیم یافتہ شخص کے لئے کسی پیشہ میں مہارت حاصل کرنا باعث ذلت تھا اور ہاتھ سے کام کرنا حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ خیالات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ بعض اوقات بڑے بڑے علماء

بھی صرف پڑھنا جانتے تھے لکھنا نہیں۔ کیونکہ لکھنے کا کام پیشہ ور کاتب کا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے ان کے خطوط' فتاویٰ۔ اور دستاویزات پر ان کے دستخط کے بجائے ان کی مہر ثبت کر دی جاتی تھی۔ جب عہد برطانیہ میں مدرسہ دیوبند میں یہ منصوبہ بنایا گیا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف پیشوں کی بھی تعلیم دی جائے تو اس کی علماء کی جانب سے سخت مخالفت کی گئی اور بالآخر یہ منصوبہ ختم کرنا پڑا۔ تعلیم یافتہ اور پیشہ وروں کے درمیان جو فرق اور دوری ہے وہ اسی دور کی روایت ہے۔

طبقاتی فرق کو برقرار رکھنے کے لئے ایک روایت یہ تھی کہ امراء کے بچے گھر پر پڑھا کرتے تھے جہاں ان کی تعلیم کے لئے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ یہ اساتذہ امراء کے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے مارے مارے پھرتے تھے۔ اسی لئے معاشرے میں اساتذہ کا سماجی مرتبہ گرا ہوا تھا۔ امراء کے بچوں کو علیحدہ سے اس لئے تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ عام لوگوں سے دور رہیں۔ عام لوگوں کے لئے مکتب ہوا کرتے تھے کہ جہاں بنیادی مذہبی تعلیم کا بندوبست تھا۔ اس کے بعد مدرسے تھے کہ جہاں مذہبی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی اور فارغ التحصیل انتظامیہ میں مفتی' قاضی' اور صدر کے عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ سیکولر علوم کے لئے علیحدہ سے کوئی اسکول یا مدرسہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ حکیم' انجینئر' مصور' اور نقاش بننے کے لئے ضروری تھا کہ کسی پیشہ ور استاد کی شاگردی اختیار کی جائے۔ عام طور سے یہ پیشہ خاندانوں میں محدود ہوتے تھے' چونکہ ان کا تعلق روزی سے تھا' اس لئے انہیں خفیہ رکھا جاتا تھا۔ اس لئے سیکولر علوم اور پیشوں پر بہت کم کتابیں لکھی گئیں۔ پیشوں کے راز خاندانوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ فنون اس وقت تک زندہ رہے یا ان میں ترقی ہوئی کہ جب تک انہیں شاہی سرپرستی حاصل تھی' جب یہ سرپرستی ختم ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ ان میں بھی زوال آگیا۔

عہد برطانیہ میں جب پہلی مرتبہ حکومت کی جانب سے اسکول کھولے گئے تو انہوں نے ہندوستان کے سماجی نظام میں زبردست تبدیلی کی' ابتداء میں اونچی ذاتوں' اور طبقہ اشراف کے لوگوں کی جانب سے ان اسکولوں کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لوگوں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو نچلی ذات کے عام بچوں کے ساتھ ایک کلاس میں اور ایک ہی بینچ پر بیٹھا دیکھیں۔ اس لئے جب ہندوؤں کی اعلیٰ ذات والوں

نے یہ اعتراض کیا وہ اور نچلی ذات والے ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اونچی ذات والے بینچوں پر بیٹھیں گے اور نچلی ذات کے بچے فرش پر برآمدے میں۔ یو پی کے شرفاء کو بھی یہ سخت ناگوار تھا کہ اشراف اور اجلاف ایک ساتھ بیٹھیں اور خاص طور سے امراء کے بچے گھر سے اسکول پڑھنے آئیں۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے امراء' روساء' اور شرفاء کے بچوں کے لئے علیحدہ سے اسکول کھولے۔ اودھ کے تعلقداروں کے بارے میں ٹامس' آر' مٹکاف نے اپنی کتاب "لینڈ' لینڈ لارڈز' اور برٹش راج" میں لکھا ہے کہ انگریزی حکام نے بڑی کوشش کی کہ تعلقداروں کے لڑکے گورنمنٹ کے اسکولوں میں آ کر تعلیم حاصل کریں' لیکن اکثر حالات میں بیگمات و رانیاں نہیں چاہتی تھیں ان کے لڑکے ان سے جدا ہوں۔ کچھ کی دلیل یہ تھی کہ ان کے لڑکے قابل اساتذہ سے گھر پر پڑھ رہے ہیں اس لئے انہیں اسکول جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکول جانے کی صورت میں ان کے لئے جو اہم مسائل تھے وہ یہ کہ لڑکوں کو کتنے ملازم رکھنے کی اجازت ہو گی اور کیا انہیں جسمانی سزا دی جائے گی؟ امراء کے اسکولوں کے ہاسٹلوں میں لڑکوں کو نہ صرف یہ کہ علیحدہ کمرہ دیا گیا بلکہ انہیں یہ سہولت بھی دی گئی کہ وہ اپنا کھانا خود تیار کرائیں۔

برطانوی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ وہ امراء' زمینداروں اور نوابین کے لڑکوں کو یورپی تعلیم دے کر انہیں اپنے لئے استعمال کریں' مگر ہوا یہ کہ یہ لڑکے ذہنی طور پر ترقی نہیں کر سکے اور آگے چل کر متوسط طبقے کے لڑکوں نے جنہوں نے عام گورنمنٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی انہوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مہم چلائی اور سیاست پر اپنا تسلط قائم کیا۔

عہد برطانیہ میں اسکول سسٹم نے ہندوستان کی سماجی' سیاسی' اور معاشی زندگی میں زبردست تبدیلی کی کیونکہ اس میں تعلیم کو مذہب سے جدا کر کے اسے سیکولر بنیادوں پر قائم کیا۔ میڈیسن' انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے اداروں نے پہلی مرتبہ ان فنون کو سب کے لئے کھول دیا' یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریزی تعلیم نے صرف کلرک پیدا کئے۔ اس تعلیم نے روشن خیال' سیکولر' اور لبرل ذہن کے لوگوں کو بھی تیار کیا کہ جنہوں نے ہندوستان کی سیاست اور سماجی بہبود کے لئے کام کئے۔ اس نظام تعلیم نے طریقہ امتحان کو بدلا' اور نصاب و غیر نصابی سرگرمیوں کو فروغ دیا تاکہ بچے ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند ہو سکیں۔

ان تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ جمہوری روایات و اقدار سے روشناس ہوا۔

(2)

تعلیم کے سلسلہ میں یہ پرانی بحث ہے کہ اس کی بنیاد کیا ہو؟ کیا اسے روحانیت کے تابع ہونا چاہئے اور کیا اسے مذہبی احکامات' وجدان' اور جذبات کے ذریعہ پھیلایا جائے یا اسے فلسفیانہ خیالات' سائنسی نقطہ نظر اور دلیل و عقلیت کی بنیاد پر منتقل کیا جائے۔ یورپ میں قرون وسطی میں تعلیم پر مکمل طور پر چرچ کا کنٹرول تھا اور اس لئے اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مذہبی عقائد کو کیسے مضبوط کیا جائے اور مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات کو کیسے ختم کیا جائے؟ اس لئے تعلیم کا مقصد عقائد کی سچائی اور آفاقیت کو قائم کرنا تھا۔ لیکن جیسے جیسے یورپ کے معاشی و سیاسی اور سماجی حالات بدلنا شروع ہوئے' وہاں ایسے علوم کی ضرورت محسوس ہونا شروع ہوئی جو بدلتے ہوئے حالات میں معاشرے کی ضروریات پوری کر سکیں۔ اس نقطہ نظر سے تعلیم کو چرچ کے تسلط سے نکالنے کی ابتداء ہوئی۔ چنانچہ ریناساں کے زمانہ میں جب ہیومنزم کے خیالات پھیلے تو مذہب کا اثر کمزور ہونا شروع ہوا اور انسان کائنات کا اہم مرکز بن گیا کہ جس کے مفاد کے لئے دنیا کو تبدیل کرنا تھا۔ اس لئے جیسے جیسے تعلیم چرچ کے اثرات سے آزاد ہوتی چلی گئی اسی طرح سے اس میں غور و فکر' اور سائنسی سوچ آتی چلی گئی۔

تعلیم کے سلسلہ میں علماء کا نقطہ نظر ابتداء ہی سے یہ رہا ہے کہ اس کا بنیادی مقصد عقائد کی خدمت ہے۔ اس لئے صرف ان علوم کا مطالعہ ضروری ہے جو ان عقائد کو مستحکم کریں۔ ایسے تمام علوم کہ جو عقائد کے سلسلہ میں شک و شبہات پیدا کریں یا جو عقائد سے لاتعلق ہوں ان کی تعلیم غیر ضروری ہے۔ اس لئے سیکولر علوم کی جانب علماء کا رویہ معاندانہ رہا ہے۔ پاکستان کے قیام نے تعلیم کے بارے میں اس مذہبی نقطہ نظر کو تقویت دی کیونکہ جب ملک کی بنیاد نظریہ بن گیا تو یہ ضروری ہو گیا کہ تعلیم کو نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور تعلیم کے نصاب کو اس طرح سے تشکیل دیا جائے کہ جو اس نظریہ کو تقویت دے۔ چنانچہ ایک طرف تو تعلیم کو مذہبی بنانے کا عمل شروع ہوا تو دوسری' دو قومی

نظریہ کی بنیاد پر تمام نصاب کو ڈھالا گیا۔ اس کے نتیجہ میں اردو ادب سے تمام ہندو ادیبوں و شاعروں کو خارج کر دیا گیا۔ تاریخ میں صرف انہیں پہلوؤں پر زور دیا گیا کہ جو قومی نظریہ سے مطابقت رکھتے ہوں۔ چنانچہ ہمارے نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذہن کو اس طرح سے ڈھالا جائے کہ جو قائم شدہ روایتی سماجی و سیاسی ڈھانچہ کو قبول کرے' اس مقصد کے لئے ان میں حب الوطنی کے جذبات کو پیدا کیا جاتا ہے تاکہ سماج کے خلاف ہر تنقید کو وطن کے خلاف قرار دے کر اسے روک دیا جائے۔ شخصیت پرستی کے خیالات کو اس لئے ابھارا جاتا ہے تاکہ تقلید کی روایات مضبوط رہیں اور ذہن نظریاتی شخصیات کی ہدایات و فرمودات کے دائرے میں محدود رہتے ہوئے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو منجمد کر دے۔ اپنے عقائد کی سچائی اور نسلی برتری کا سبق دے کر دوسروں کے بارے میں تعصب و نفرت پیدا کی جاتی ہے تاکہ مقابلہ اور جنگ کے لئے ہمیشہ دشمنوں کا وجود رہے اور اس جنگجویانہ ذہنیت کے نتیجہ میں وطن کے دفاع کے نام پر ایک طرف فوجی اخراجات بڑھیں تو دوسری طرف عوام کے بنیادی حقوق کو تحفظ کے نام پر غصب کیا جاتا رہے۔ ماضی کی عظمت کو اس طرح سے پیدا کیا جائے کہ حال کی پس ماندگی ان جذبات میں چھپ جائے۔ یہ نصاب تعلیم ایک ایسی نسل کو پیدا کر رہا ہے کہ جو متعصب' تنگ نظر' اور نااہل ہے۔ اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کو سب سے زیادہ نقصان پڑھے لکھے لوگ پہنچا رہے ہیں تو اس کے پس منظر میں یہی تعلیمی نظام ہے۔

اس کے علاوہ اس نصاب تعلیم کا ایک نقص یہ ہے کہ اس میں جمہوری اقدار اور روایات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے تعلیم کے حصول میں ہر شخص کو برابر کے مواقع نہیں ہیں' تعلیمی اداروں کی تقسیم مالی وسائل کے لحاظ سے ہے' غریب لوگ اگر ممکن ہوتا ہے تو بچوں کو مکتب و مدرسے بھیج دیتے ہیں' متوسط و امراء کے لئے علیحدہ سے اسکولز کالجز ہیں' لہٰذا یہ نظام تعلیم ابتداء ہی سے طبقاتی فرق کو پیدا کر دیتا ہے اور تعلیم کے مواقع ذہانت سے زیادہ مالی وسائل پر ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں طبقاتی شعور بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کہ جو اعلیٰ نجی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر یورپ امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لیتے ہیں' ان کے نزدیک عوام ان پڑھ' جاہل' اور غیر مہذب ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہی لوگ حکمراں بنتے ہیں تو ان

کا فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کو صرف جبر' تشدد' اور خوف سے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری اقدار کو سب سے زیادہ پامال آکسفورڈ' برکلے' اور ہارورڈ کے پڑھے ہوئے لوگوں نے کیا ہے۔

(3)

جدید تاریخ میں دو مثالیں ایسی ہیں کہ جن میں حکومت کی جانب سے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ معاشرے میں تعلیم کو عام کیا گیا اور نصاب کی تشکیل اس انداز میں کی گئی کہ جو حالات سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہ انیسویں صدی میں جاپان میں میجی دور حکومت اور جرمنی میں پروشیا کی سلطنت میں ہوا۔ نظام جاگیرداری کے خاتمہ اور تعلیم کے حصول کے مساوی اصول نے ان دونوں معاشروں میں انقلابی تبدیلی کی اور انہیں جاگیردارانہ دور کی پس ماندگی سے نکال کر جدید عہد کی روایات سے روشناس کرایا۔

موجودہ صورت حال میں ہمارے ہاں یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ تعلیمی نظام کو اوپر سے حکومت تبدیل کرے۔ کیونکہ ایک طرف جاگیردارانہ معاشرہ تعلیم کا فروغ نہیں چاہے گا تو دوسری طرف فوجی اخراجات تعلیم کے پھیلاؤ میں رکاوٹ بنیں گے۔ اس کے علاوہ جب تک اس ملک کی بنیاد مذہب اور نظریہ پر رہے گی اس وقت تک نصاب ان کی قید سے آزاد نہیں ہو گا۔ ایک روشن خیال' روادار' اور تنقیدی و تحقیقی اور تخلیقی ذہن کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم اور اس کا نصاب جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر ہو۔ اور یہی مقصد ایک متبادل تعلیمی [illegible] ہونا چاہئے۔

سیاست و حکومت

لغت میں سیاست کے دو معنی ہیں: انتظام چلانا، اور نگہبانی اور نگہداشت کرنا۔ اور دوسرے معنوں میں اذیت و سزا دینا۔ ماضی میں چونکہ حکومت کا یہ تصور تھا کہ انصاف اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ لوگوں پر پوری طرح سے کنٹرول رکھا جائے اور سزاؤں کے خوف سے انہیں حکم عدولی سے دور رکھا جائے۔ اس طرح سیاست کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چونکہ سیاست کا تعلق حکومت اور انتظام سے تھا، اس لئے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا تعلق صرف حکمراں طبقوں سے ہے اور عوام کو اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے۔ ان کے لئے سیاست کے قریب جانا یا اس میں الجھنا غداری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ عوام کا سیاسی معاملات یا سیاسی امور میں دخل اندازی کا مطلب تھا کہ وہ حکمرانوں کے معاملات میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے تاریخ میں عام آدمی کا رویہ یہ تھا کہ "کار حکمرانی خسرواں دانند" یعنی حکومت کے کام بادشاہ ہی جانتا ہے۔ یا اسے ہی یہ حق ہے کہ وہ جس طرح سے چاہے حکومت کرے۔

سیاست کے بارے میں ہمارے یہی رویے تھے جو کہ برطانوی دور حکومت میں بھی جاری رہے۔ جب ہندوستان میں 1885ء میں کانگرس پارٹی قائم ہوئی اور اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو اس پر سید احمد خان نے زبردست رد عمل کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ سیاست میں قطعی حصہ نہ لیں۔ اس کے پس منظر میں سیاست کا یہی نقطہ نظر تھا کہ سیاست حکمرانوں کے لئے ہے اور عوام کے لئے صرف فرماں برداری اور اطاعت کرنا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اگر مسلمانوں نے سیاست میں حصہ لیا تو اس کی وجہ سے انگریز حکمراں ناراض ہو جائیں گے اور مسلمانوں کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔

تحریک پاکستان کے دوران ایک تھوڑا سا وقت وہ آیا کہ جس میں ہندوستان کے

مسلمانوں نے سیاست میں حصہ لیا اگرچہ یہ سیاست ایجی ٹیشن کی سیاست تھی اور اس کا رخ زیادہ تر کانگرس پارٹی سے مخالفت کا تھا۔ مگر اس میں شہری آبادی' طالب علموں' مزدوروں اور عورتوں نے حصہ لیا۔ مگر جیسے ہی پاکستان قائم ہوا' تو فوراً اس نظریہ کا احیاء کیا گیا کہ طالب علموں' مزدوروں' اور عورتوں کے لئے سیاست اچھی چیز نہیں ہے اور حکمراں طبقوں کو یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ بغیر کسی تنقید کے حکومت کر سکیں۔

عوام کو سیاست سے روکنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ یہ تھے کہ ملک کا کوئی دستور نہیں بنایا گیا اور نہ ہی عام انتخابات کرائے گئے تاکہ عوام کی نمائندگی کے بغیر حکومت کی جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتدار کے خواہش مند گروہوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ سازش اور دھوکے سے حکومت پر قابض ہوں۔ اس لئے پاکستان کی ابتدائی تاریخ انہیں فریب کاریوں' چالاکیوں' اور سازشوں کی تاریخ ہے کہ جس میں ایک گروہ دوسرے کو اقتدار سے محروم کر رہا ہے اور عوام خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

جب ملک میں ایوب خاں نے پہلی فوجی حکومت قائم کی تو اس کے بعد سے تو سیاست عوام کے لئے شجر ممنوعہ ہو گئی۔ ایسے تمام جمہوری ادارے اور روایات کہ جس سے عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوتا انہیں ایک ایک کر کے تباہ کر دیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں طلباء کی یونین ختم کر دی گئی۔ ٹریڈ یونینوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی گئیں' پریس کو سنسرشپ کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ عوام کو سیاست سے اس قدر خوف زدہ کیا گیا کہ سیاست پر گفتگو کرنا بھی ایک جرم ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب ہوٹلوں میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ "یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔"

پاکستان کے ابتدائی دور میں سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی وجہ سے اور بعد میں فوجی حکومتوں کے محدود انتخابات اور نامزدگیوں کے طریقہ کار کی وجہ سے عوام سیاست سے علیحدہ رہے۔ اور جب پہلی مرتبہ 1971ء میں عوام میں روٹی' کپڑا' اور مکان کے نعرہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور اس کی حمایت کی تو اس کے بدلہ میں انہیں لاٹھی' گولی اور مہنگائی ملی' تو اس سے سیاست کے منفی اثرات اور زیادہ ابھرے۔ اس پس منظر میں سیاست کا مفہوم بدل کر رہ گیا۔ اب اس کا مطلب ہے چالاکی' دھوکہ دہی' اور کسی کے

ساتھ فریب کرنا' اسی لئے عام گفتگو میں کہا جاتا ہے کہ "میرے ساتھ یہ سیاست نہیں چلے گی" اس وقت اگر سماجی کارکن' یا راہنما کو اپنے بارے میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ یہ وضاحت کرتا ہے کہ "میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں" یا میں "سیاسی آدمی نہیں ہوں" تاکہ سیاست سے دست برداری کے بعد وہ لوگوں میں اعتماد پیدا کر سکے۔

سماجی جماعتوں اور کارکنوں اور عام آدمیوں کی سیاست سے اس لاتعلقی کے نتیجہ میں سیاست صرف چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جب یہ کوشش کی جائے کہ سیاست کو زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے نکال دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں معاشرے میں بے حسی اور ناامیدی پیدا ہو گی۔ چونکہ سیاست مخصوص لوگوں کی جاگیر ہو گئی ہے اسی لئے وہ لوٹ پھیر کے اقتدار میں آتے ہیں اور حکومت کو اپنے ذاتی یا خاندانی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اور یقیناً یہ حکمراں طبقوں کے مفاد میں ہے کہ عوام میں سیاست کے بارے میں منفی رویہ رہے اور وہ اس سے دور رہیں' کیونکہ اسی صورت میں ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہو گا اور وہ آرام سے حکومت کر سکیں گے۔

جمہوری سیاست

دنیا کے سب ہی جمہوری ملکوں میں جمہوریت کا ارتقاء آہستہ آہستہ ہوا۔ ابتداء میں متوسط طبقوں نے امراء اور جاگیرداروں کے تسلط کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے لئے سیاسی حقوق طلب کئے۔ جب انہیں یہ حقوق مل گئے تو انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اب یہ حقوق انہیں تک محدود رہیں اور ان میں عام لوگوں کو شامل نہیں کیا جائے۔ اس لئے یہ لوگ لبرل ازم کے تو حامی تھے مگر مساوات کے خلاف تھے۔ یہ پارلیمنٹ کی حکمرانی کے تو قائل تھے مگر عوام کو حکمراں تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اسی وجہ سے ابتداء میں امیدواروں اور ووٹروں کے لئے یہ شرط تھی کہ ان کے پاس یا تو جائداد ہو اور یا وہ ٹیکس ادا کرتے ہوں۔ اس طرح سے صرف امراء اور متوسط طبقوں کو سیاست میں آنے کا حق مل جاتا تھا' جب کہ عوام اس سے محروم رہتے تھے۔ یہ بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپی ملکوں میں عام لوگوں کو بشمول عورتوں کے ووٹ کا حق ملا اور حق بالغ رائے دہی کو جمہوریت

کا اہم ستون بنایا گیا۔

برطانوی دور حکومت میں جب برصغیر میں انتخابی اداروں کو روشناس کرایا گیا تو اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ووٹ کا حق محدود لوگوں کو دیا جائے تاکہ وہی لوگ منتخب ہو سکیں جو حکومت کے وفادار ہوں۔ اس لئے حکومت کی جانب سے ایسے اقدامات کئے گئے کہ جن کی وجہ سے تعلیم یافتہ اور سیاسی شعور رکھنے والے لوگ سیاست میں حصہ نہ لے سکیں۔ ملک کی اکثریت جو کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل تھی وہ تو صاحب جائداد نہ ہونے اور ٹیکس نہ ادا کرنے کی وجہ سے سیاسی عمل سے دور ہو گئے۔ اس کے بعد حکومت کے ملازمین کے لئے سیاست میں آنا قانون کی خلاف ورزی ہوئی۔ لہٰذا تعلیم یافتہ متوسط و امراء طبقوں میں تاجر' ڈاکٹر' وکیل' اور جاگیردار رہ گئے۔ ان میں سے بھی تاجر' ڈاکٹر یا انجنیئر اپنے پیشوں میں مصروفیت کی وجہ سے سیاست میں نہیں آ سکے۔ صرف وکیلوں کا وہ طبقہ تھا جس نے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' طارق علی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وکیل سیاستدانوں کی وجہ سے برصغیر کی سیاست ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہی اور انقلابی نہیں بن سکی۔ جب سیاست میں حصہ لینے والوں کا طبقہ محدود ہو گیا تو برطانوی حکومت کے لئے مشکل نہیں رہا کہ وہ ان سے اپنے مفادات کے تحت گفت و شنید کر سکیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد اگر بالغ رائے دہی کے حق کو تسلیم تو کر لیا گیا۔ مگر بہت سی برطانوی روایات کو حکمراں طبقوں نے اپنے مفادات کی حفاظت کی خاطر باقی رکھا۔ مثلاً سرکاری ملازموں کو سیاست میں حصہ لینے کا حق نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے۔ اس میں نہ صرف انتظامیہ کے لوگ آتے ہیں بلکہ اساتذہ' انجنیئر ڈاکٹر اور دوسرے پیشہ ور بھی آتے ہیں کہ جو سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ بعد میں اسی روایت کو غیرسرکاری اداروں نے بھی اختیار کر لیا اور اپنے ملازموں پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوسط طبقہ جو تعلیم و ذہانت دونوں میں آگے بڑھا ہوا ہے وہ سیاسی عمل کا حصہ نہیں بن سکا اور سیاست جاگیرداروں کا مشغلہ ہو کر رہ گئی۔

پاکستان کے ابتدائی زمانے میں معاشرے کے دو طبقے ایسے تھے کہ جن سے امید کی جاتی تھی کہ وہ پاکستان کی سیاست میں تبدیلی لے کر آئیں گے اور اس کے مردہ ڈھانچہ میں نئی زندگی پیدا کریں گے۔ یہ طالب علم اور مزدور تھے۔ اسی لئے ابتدائی دنوں میں طالب

علموں کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں' اور یہی حال ٹریڈ یونینوں کا تھا۔ ایک طرف یہ جمہوری روایات و اداروں کی بقا کی امید تھے تو دوسری طرف آمرانہ طرز حکومت کو روکنے والے۔ یہ دونوں طبقے جمہوری کردار کے حامل تھے کیونکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یونین کے انتخابات اور ٹریڈ یونین میں عہدے داروں کا انتخاب جمہوری طریقہ کار پر ہوا کرتا تھا۔ اس لئے ان میں جمہوری' لبرل' اور سیکولر اقدار تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی ایوب خاں نے فوجی حکومت قائم کی' اس نے سب سے پہلے ان دو طبقوں پر وار کیا۔ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی یونین پر پابندی لگا کر طلباء کے لئے سیاست ممنوع قرار دیدی' اور یہی عمل ٹریڈ یونین کا ہوا کہ جس پر لاتعداد قانونی پابندیاں لگا دی گئیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی اداروں میں لاتعداد طلبہ جماعتیں وجود میں آ گئیں' چونکہ ان میں سے کوئی بھی منتخب ہو کر نہیں آئی تھی اسی لئے ہر جماعت کو دعویٰ تھا کہ وہ طلباء کی نمائندہ ہے۔ نمائندہ جماعت بننے کے لئے انہوں نے تشدد اور ہنگاموں کے طریقوں کو اختیار کیا تاکہ طلباء کو زبردستی اپنا وفادار بنایا جائے۔ اس کی وجہ سے ان کی سیاست داخلی ہوتی چلی گئی اور یہ ملکی سیاست اور عوامی مسائل سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہی کچھ مزدوروں کی جماعتوں کا ہوا کہ جن کی سیاست کا دائرہ صرف فیکٹریوں تک محدود ہو گیا۔

طلباء اور مزدوروں کو ملکی سیاست سے نکالنے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں پر فوجی آمروں اور جمہوری ڈکٹیٹروں کو آرام سے حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔ ضیاء الحق کے پورے دور میں طالب علموں یا مزدوروں کی جانب سے کوئی احتجاج نہیں ہوا کہ جس میں جمہوری حقوق اور آمرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف بات کی گئی ہو۔

آج صورت حال یہ ہے کہ معاشرے کے باشعور اور تعلیم یافتہ طبقے سیاست سے جدا کر دئے گئے ہیں' اور سیاست صرف جاگیردار طبقے کی ملکیت بن کر رہ گئی ہے۔ آئندہ خدشہ یہ ہے کہ اس میں ڈرگ مافیا اور اسمگلر بھی شامل ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ملک میں جمہوری اداروں اور روایات کو قائم کرنے کے امکانات بھی کم ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب تک سیاست میں عوام کو آنے کا موقع نہیں ملے گا اور ان کی بالادستی کو قائم نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک یہ نام نہاد جمہوری ادارے عوام کا استحصال کئے جائیں گے۔

سیاسی جماعتیں

جمہوری معاشرے میں انتخابات کے ذریعہ سیاستداں اقتدار میں آتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عوام کی رائے کو اپنے حق میں تیار کریں' اس مقصد کے لئے وہ سیاسی جماعتیں تشکیل دیتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ ہر سیاسی جماعت رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنا منشور اور اغراض و مقاصد رکھتی ہے۔ اس کا یہ منشور اور پارٹی کے اغراض و مقاصد وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ معاشرے کو جس قسم کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے انہیں مدنظر رکھتے ہوئے یہ اپنی جماعت کے منشور کو بناتی رہتی ہیں۔

جمہوری معاشرے میں سیاسی جماعت کا ڈھانچہ بھی جمہوری ہوتا ہے۔ عہدے دار اور مختلف کمیٹیاں باقاعدہ سے منتخب ہوتی ہیں۔ اگر پارٹی کا سربراہ انتخابات میں یا دوسرے سیاسی و سماجی و معاشی بحران میں کامیاب نہیں ہوتا ہے تو اس صورت میں یا تو اس سے استعفی لے لیا جاتا ہے یا وہ خود ذمہ داری قبول کر کے پارٹی کی سربراہی سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پارٹی میں کسی ایک خاندان کی اجارہ داری نہیں ہوتی ہے۔ اور نہ ہی سربراہی یا عہدوں کے لئے دولت مند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ترقی کا دار و مدار ذہانت' صلاحیت' اور سیاسی تدبر پر ہوتا ہے۔

چونکہ پارٹی عوام کے دئے ہوئے چندوں پر چلتی ہے' اس لئے ایک تو اس میں پارٹی کے عام کارکنوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ دوسرے انتخابات کے اخراجات پارٹی اٹھاتی ہے اس لئے امیدواروں کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دولت والے ہوں۔ اس کے علاوہ ان سیاسی جماعتوں کے اپنے تحقیقی ادارے ہوتے ہیں کہ جہاں سیاسی' اقتصادی' اور سماجی موضوعات پر تحقیقی مقالات و کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔ پارٹی کے عہدے دار اور کارکن تقاریر و سمناروں کے ذریعہ حالات حاضرہ سے باخبر رہتے ہیں۔ پارٹی اپنے کارکنوں کو اس وقت کے لئے تیار رکھتی ہے کہ وہ جب بھی اقتدار میں آئے تو اس کے پاس حکومت کے تمام شعبوں کے ماہرین ہوں۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں سیاسی جماعتیں کسی نظریہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہوتی ہیں'

سوائے مذہبی جماعتوں کے کہ جو مذہبی نظام نافذ کرنے کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اس کے بجائے ان پارٹیوں پر یا تو شخصیتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور یا خاندانوں کا۔ لہذا یہ شخصیتیں اور خاندان پارٹی کو بھی اپنی جاگیر سمجھتی ہیں اور اس کی سربراہی پر اپنا موروثی حق جماتی ہیں۔ اسی لئے ان پارٹیوں میں نہ تو انتخابات ہوتے ہیں اور نہ ہی پارٹی کے عام کارکنوں کو اس بات کا حق ملتا ہے کہ وہ پارٹی کے امور اور معاملات میں اپنی رائے دیں۔ ان کے اور پارٹی کے راہنماؤں کے درمیان وہی رشتہ ہوتا ہے جو کہ جاگیردار اور ہاری کے درمیان۔ یعنی اندھی وفاداری اور تابع داری۔ جو پارٹی کی پالیسیوں پر تنقید کرتا ہے اسے غداری کے مترادف مانا جاتا ہے اور ایسے شخص کو یا تو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے یا اسے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

انتخابات میں پارٹی کی جانب سے جو امیدوار نامزد کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں دو باتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ پارٹی کو کتنا چندہ دیں گے اور الیکشن میں کتنا خرچ کر سکتے ہیں' اور ان کا اپنے حلقہ انتخابات میں کتنا اثر ہے۔ اس وجہ سے اکثریت امیدوار زمیندار' جاگیردار' یا اسمگلنگ اور ڈرگ مافیا کے لوگ ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خرچہ کر کے الیکشن لڑتے ہیں۔ اس لئے جیتنے کی صورت میں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کریں۔ اسی چیز نے ان سیاستدانوں کو بدعنوان بنا دیا ہے۔

چونکہ پارٹی الیکشن جیتنے کے لئے ان امیدواروں پر بھروسہ کرتی ہے کہ جو اپنی انفرادی حیثیت سے جیتتے ہیں' اس لئے پارٹی کو کوئی منشور اور لائحہ عمل دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ ہاں وہ الیکشن کے موقع پر عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لئے کچھ نعرے ضرور لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے پارٹی کی اپنی کوئی حیثیت ابھر کر نہیں آتی ہے۔ جب یہ منتخب نمائندے یا امیدوار اپنے مفادات کے تحت پارٹی بدلتے ہیں' تو یہ سیاسی نظام کو اور زیادہ کمزور کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انتخاب کی کامیابی ان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں اقتدار والی پارٹی میں سیاستدانوں کے لئے زیادہ دلکشی ہوتی ہے۔

چونکہ ہماری سیاست پر جاگیردار قابض ہیں۔ اس لئے سیاسی جماعتوں میں سربراہی کے مسئلہ پر ہمیشہ جھگڑے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ پہلے نمبر

پر وہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی اختلافات کی بنیاد پر پارٹیوں کے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں اور ہر شخص اپنی جماعت بنا کر اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔

ہماری سیاسی پارٹیاں صرف الیکشن کے موقع پر سرگرم ہوتی ہیں' ورنہ اس سے پہلے ان کے بیانات صرف اخباروں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا' انہیں ملک کی صحیح صورت حال سے باخبر کرنا' اور بدلتے ہوئے حالات میں خود کی تربیت کرنا' یہ سب ان سیاسی پارٹیوں کے لئے لایعنی باتیں ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری سیاسی پارٹیوں کے نہ تو تحقیقی سیل ہوتے ہیں' اور نہ ہی ملکی و غیر ملکی حالات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی پارٹی کے سربراہ اور عہدے دار حکومت کے امور میں کوئی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب یہ اقتدار میں آتے ہیں تو انہیں جن شعبوں کا وزیر بنایا جاتا ہے' ان کے بارے میں کوئی تجربہ نہیں ہوتا ہے اور انہیں راہنمائی کے لئے بیوروکریسی سے مدد لینی پڑتی ہے جس کے نتیجہ میں سیاستدان کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں' اور افسران کی اہمیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کے اس کردار کی وجہ سے ملک میں جمہوری روایات و اداروں کی تشکیل کے امکانات بہت کم ہیں۔ جب تک یہ پارٹیاں خود کو جمہوری شکل نہیں دیں گی اس وقت تک معاشرے میں بھی جمہوری قدروں کا رواج نہیں ہو گا۔ جب تک ان پارٹیوں میں عام کارکنوں کو نمائندگی کا حق نہیں ملے گا' اس وقت تک ان کی بنیاد محدود مفادات پر رہے گی' اور جب تک جاگیردار ان پر قابض رہیں گے اس وقت تک سیاست کو وہ صرف اپنے مفادات پورا کرنے میں استعمال کرتے رہیں گے۔ اس لئے عوامی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک ایسی سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے جو عوام میں سے ابھرے اور عوام کی خواہشات کی ترجمانی کرے۔

نظریاتی سیاسی جماعتیں

پاکستان میں نظریاتی سیاسی جماعتوں کو دائیں اور بائیں نظریات کی بنیاد پر شناخت کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے فورا بعد مذہبی جماعتوں کو اس لئے مقبولیت نہیں ہوئی کیونکہ ان میں سے اکثر نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جماعت اسلامی نے اس

ابتدائی دور میں اپنی توجہ سیاست سے زیادہ تبلیغی مشن پر دی' یعنی جماعت کے کام کو لوگوں میں پھیلانے پر زور دیا۔ رہیں بائیں بازو کی جماعتیں تو وہ امریکی اثر و رسوخ کی وجہ سے عتاب میں رہیں' اور ان کے خلاف حکومت کا یہ پروپیگنڈہ رہا کہ وہ مذہب کے خلاف ہیں' اس لئے ریاست کے بنیادی نظریہ کو ان کی سرگرمیوں سے نقصان ہو گا۔ ان وجوہات کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی جس کی وجہ سے اس کے کارکنوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ سرگرمی سے سیاسی کام کر سکیں۔

اس صورت حال میں بائیں بازو کے کارکنوں نے اس پالیسی کو اختیار کیا کہ ان سیاسی پارٹیوں میں شمولیت اختیار کی جائے کہ جو ان کے منشور اور لائحہ عمل سے قریب ہوں۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی میں ایک عرصہ تک یہ کارکن کام کرتے رہے۔ جب بھٹو نے پی پی پی کی تشکیل کی تو بہت سے بائیں بازو کے کارکن اس امید میں اس میں شامل ہوئے کہ وہ اس میں رہتے ہوئے اپنے منشور کو نافذ کرا سکیں گے۔ مگر جیسا کہ حالات سے ثابت ہوا' بائیں بازو کے کارکنوں کی ان پارٹیوں میں شمولیت سے خود ان پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کو تو فائدہ ہوا مگر انہوں نے بائیں بازو کے نظریات کو نافذ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور جیسے موقع ملا ان کارکنوں کو پارٹی سے نکال باہر کیا۔

بائیں بازو کی پارٹیوں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دوسری سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر کے کیوں اپنی توانائی کو ضائع کیا' کیونکہ اس صورت میں ان کی اپنی علیحدہ سے کوئی شناخت نہیں ابھر سکی اور لوگ ان کے نظریات اور ان کے منشور سے واقف نہیں ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو ان جماعتوں پر حکومت کی پابندیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ قانونی طور پر کھل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے بائیں بازو کی جماعتوں کے خلاف برطانوی دور سے جو پروپیگنڈا تھا' اس کی وجہ سے لوگوں میں ان کے بارے میں عجیب و غریب خیالات جڑ پکڑ گئے تھے۔ خفیہ طور پر کام کرنے کی وجہ سے کارکن پراسرار شخصیت بن گئے تھے۔ انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اس پروپیگنڈے کے خلاف کچھ کر سکیں اور عوامی رائے کو اپنے لئے ہموار کر سکیں۔ ایک اعتراض ان پر یہ تھا کہ یہ روسی ایجنٹ ہیں' اور اپنے ملک سے زیادہ روسی مفادات کے لئے کام کرتے ہیں۔ اس اعتراض کو اس وقت اور تقویت ملتی تھی جب یہ ہر روسی پالیسی کی حمایت کرتے تھے

اور قومی مسائل کو روسی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔

اگرچہ اب بائیں بازو کی جماعتوں سے پابندی اٹھا لی گئی ہے مگر اس کے باوجود نظریاتی طور پر اس قدر بٹے ہوئے ہیں کہ باوجود کئی کوششوں کے یہ نہ تو متحد ہو سکے ہی علیحدہ سے اپنی شناخت بنا سکے۔ خصوصیت سے روس میں اشتراکی نظریہ کے زوال کے بعد تو بائیں بازو کے کارکنوں نے بالکل خاموشی اختیار کر لی ہے' حالانکہ اب ان کے لئے یہ ایک موقع تھا کہ روسی اثر سے آزاد ہو کر وہ اپنے قومی مسائل کا تجزیہ کرتے اور ملک کی سیاست پر اثر انداز ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس بائیں بازو کے راہنماؤں نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنی زندگیاں سنوارنے میں مصروف ہو گئے اور عام کارکنوں کو مایوسی کے حالات میں تن تنہا چھوڑ دیا۔

مذہبی جماعتوں میں سب سے زیادہ موثر جماعت اسلامی ہے۔ ابتداء میں جماعت کو سیاسی کام کرنے میں اس لئے دقت پیش آئی کہ اس کے خلاف یہ دلیل تھی کہ انہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کو ایک عرصہ خود کو اس الزام سے صاف کرنے میں لگا۔ انہوں نے مولانا مودودی کی کتاب "مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد" سے اس مواد کو نکال دیا کہ جو پاکستان کی مخالفت میں تھا اور اس کا نیا ایڈیشن کانٹ چھانٹ کے بعد شائع کیا گیا۔ اس کے بعد جماعت نے یہ دلیل دی کہ چونکہ پاکستان اسلام کے لئے بنایا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کا کام صرف وہی بحیثیت مذہبی جماعت کے کر سکتی ہے۔ سیکولر سیاسی جماعتیں اسلامی نظریاتی ملک میں نہیں ہونی چاہئیں۔

لیکن ایسے بہت سے مذہبی فرقے جو جماعت اسلامی کے نظریات سے متفق نہیں تھے انہوں نے اپنی اپنی سیاسی جماعتیں بنانا شروع کر دیں اور اس طرح سے مذہبی فرقوں کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ اگرچہ اب تک جو انتخابات ہوئے ان میں یہ مذہبی جماعتیں کامیاب تو نہیں ہو سکیں مگر ان کی حیثیت پریشر گروپس کی ہے کہ جو حکومتوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان کے منشور کا نفاذ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو سے لے کر نواز شریف اور بینظیر بھٹو ان کے پریشر کے تحت ان کے ہاتھوں یرغمالی بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے سوال ہوتا ہے کہ کیا اقتدار میں آئے بغیر یہ اپنے منشور کو حکمراں جماعت کے ذریعہ نافذ کر سکیں گی؟ اور کیا اس عمل کے نتیجہ میں ان کی اپنی حیثیت ختم ہو جائے

گی، کیونکہ اس طرح آخر میں ان کے پاس دینے کو کچھ نہیں رہے گا؟ یہ صحیح ہے کہ اکثر مذہبی جماعتوں نے فوجی آمریت کا ساتھ اسی لئے دیا کہ وہ اس کے سہارے اپنے منصوبوں کو پورا کرنا چاہتے تھے، مگر اس پورے عمل میں آمروں نے انہیں استعمال کیا اور اپنی جڑوں کو مضبوط کیا۔ اور آج بھی ہر حکمراں سیاسی جماعت نظام مصطفیٰؐ کو نافذ کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مگر ان جماعتوں کا اصرار یہی رہتا ہے کہ اصلی نظام وہ نافذ کریں گے۔ اس طرح مذہبی جماعتوں کے بالواسطہ اور بلاواسطہ عمل دخل نے سیاست اور حکومت کو انتشار میں مبتلا کر دیا ہے اور ہر مسئلہ کی بحث اس پر محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ اسلامی کیا ہے اور غیر اسلامی کیا؟

ان نظریاتی سیاسی جماعتوں کے کردار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی راہنمائی متوسط طبقے کے لوگ کر رہے ہیں۔ یہاں جاگیردار اور وڈیرے نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ابتدائی دور میں انہیں مالی پریشانیاں تھیں، اور ان کے مالی وسائل چندے اور عطیات تھے۔ بائیں بازو والوں کو روس سے جو مدد ملتی تھی وہ بہت کم تھی، مگر دائیں بازو والوں کو 1970ء کی دھائی میں جو عرب ملکوں سے مدد ملنا شروع ہوئی ہے اس نے ان کے پورے کردار کو بدل دیا ہے۔ اب ان کے پاس دولت کی ریل پیل ہے، ان کے تنخواہ یافتہ کارکن ہیں، اور ان کا بیوروکریٹک ڈھانچہ ہے۔ مگر پیسہ کے ساتھ ہی جو ایک تبدیلی آئی وہ یہ کہ ان کے پاس وہ جذبہ اور ایثار نہیں رہا جو کہ غربت کے زمانہ میں تھا۔

قوم پرست سیاسی جماعتیں

پاکستان کے قیام کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی یہ ان کے مفاد میں تھا کہ مرکزی حکومت کے پاس اختیارات ہوں تاکہ وہ ان اختیارات کو استعمال کر کے اپنی پالیسیوں کو نافذ کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس نظریہ کو فروغ دیا کہ صوبائی و علاقائی قوم پرستی تعصب پر مبنی ہے اور لوگوں کو اپنی صوبائی شناخت ختم کر کے صرف قومی شناخت کو باقی رکھنا چاہئے۔ یہ نظریہ ابتدائی سالوں میں تو مضبوط رہا مگر جیسے جیسے چاروں صوبوں میں متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اضافہ ہوا، اور انہیں ملازمتوں کے حصول میں مشکلات پیش آنے لگیں تو اس کے نتیجہ میں ایک قومی نظریہ ان کی راہ میں

حائل ہونے لگا۔ چنانچہ اس کے ردعمل میں ایسی قوم پرست جماعتوں کی ابتدا ہوئی کہ جن میں متوسط طبقوں کے نوجوان زیادہ تھے۔ یہ تحریکیں تعلیمی اداروں سے شروع ہوئیں۔ ان قوم پرست سیاسی جماعتوں کے منشور میں متوسط تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مفادات پوری طرح سے عیاں ہوتے ہیں : مثلاً سرکاری ملازمتوں اور پروفیشنل کالجوں میں داخلے کے لئے نشستوں کا مطالبہ سب سے اہم ہے۔

یہ قوم پرست جماعتیں خود کو ان سیاسی پارٹیوں سے علیحدہ کرلیتی ہیں کہ جو ملکی و قومی سطح پر ہیں کیونکہ یہ پارٹیاں ان کے مفادات کو پورے نہیں کرتی ہیں۔ اسی طرح سے ان کی سربراہی متوسط طبقے کے لوگوں کے پاس ہے کیونکہ جاگیردار اور زمیندار اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ ان جماعتوں میں شامل ہوں کہ جو ملکی سطح کی ہوں اور جو اقتدار میں آتی ہوں۔ اگرچہ یہ کھل کر قوم پرست جماعتوں کی مخالفت بھی نہیں کرتے ہیں بلکہ اکثر ان کے خطرے سے ڈر کر حکومت کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کے مطالبات پورے کرے۔

ان جماعتوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ ان کے سرگرم کارکن متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کا رشتہ عوام سے کٹا ہوتا ہے اور ان کے منشور میں ایسے مطالبات کا ذکر نہیں ہوتا ہے کہ جس کا تعلق عوام سے ہو۔ یعنی یہ تعلیمی اداروں میں کوٹہ سسٹم کی تو بات کرتے ہیں، مگر عوام کو تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کی بات کا ان کے ہاں کوئی مطالبہ نہیں ہوتا' یہ مطالبہ تو ہوتا ہے کہ میڈیکل و انجینئرنگ کالجوں میں ان کے لئے سیٹیں ہوں، مگر عوام کو بنیادی سہولتیں ملنی چاہئیں یا نہیں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے اور متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان فرق پیدا ہو گیا ہے' اور جیسے جیسے ان کے مطالبات پورے ہوتے جاتے ہیں اسی طرح سے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسی نظام کو برقرار رکھا جائے اور اپنی حیثیت کو مضبوط بنایا جائے۔

ان قوم پرست جماعتوں کے مضبوط مرکز تعلیمی ادارے ہیں' چونکہ جب تک ان کے ہاتھ میں ڈگریاں نہیں ہوں گی' اس وقت تک ان کی ملازمتوں کے امکانات بھی کم ہوں گے' اس لئے یہ ان جماعتوں کا نصب العین ہے کہ اپنے لوگوں کو جلد سے جلد ڈگریاں ملنی چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آسان طریقہ یہ نکالا گیا کہ امتحان میں نقل کی جائے' استادوں کو ڈرا دھمکا کر زیادہ سے زیادہ نمبر لئے جائیں اور کسی نہ کسی طرح سے

ڈگری حاصل کر لی جائے تاکہ اس کی بنیاد پر سرکاری ملازمت لی جا سکے۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف تعلیمی اداروں کا ڈسپلن خراب ہوا' بلکہ تعلیمی معیار بری طرح متاثر ہوا' اور وہاں تعلیم کے بجائے ان جماعتوں کی سرگرمیاں رہ گئیں۔

قوم پرست جماعتوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بنیاد علاقائی قوم پرستی پر رکھی' اور اس کو مضبوط کرنے کی غرض سے تاریخ سے مدد لی۔ چنانچہ دھرتی اور زمین ان کی خاص اور اہم علامتیں ہیں۔ اس کے تحت جن کا اس دھرتی اور زمین سے تعلق ہے اس کا حق ہے کہ وہ اس سرزمین کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور جو اس دھرتی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں انہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق نہیں۔ دھرتی کے اس تصور سے ان کے ہاں شخصیت پرستی پر بڑا زور ہے۔ ان شخصیتوں میں صرف سیاسی ہیروز ہی نہیں بلکہ شاعر و ادیب' صوفی و عالم' اور موسیقار سب ہی شامل ہیں۔ ان ہیروز کے ساتھ ساتھ غداروں کا بھی ذکر ہے کہ جنہوں نے دھرتی کے ساتھ دھوکہ کیا اور اس سے بیوفائی کی۔ ہیروز اور غداروں کے اس تصور کے پس منظر میں یہ پیغام ہے کہ جو لوگ قوم پرست تحریکوں کا ساتھ دیں گے' ان کے لئے قربانیاں دیں گے' ان کا درجہ بھی معاشرہ میں بڑا ہو گا' مگر جو لوگ ان کے ساتھ دھوکہ کریں گے' وہ غدار سمجھے جائیں گے اور معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں ہو گی۔ ہیروز اور غداروں کی تلاش میں یہ قوم پرست تحریکیں اس حد تک آگے گئیں کہ انہوں نے بہت سی گمنام شخصیتوں کو اعلیٰ مقام دیدیا۔

قوم پرست جماعتوں کے ہاں زبان کی اہمیت پر بہت زیادہ زور ہے اور اس لحاظ سے یہ اپنی شناخت مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ زبان کی بنیاد پہ استوار کرتے ہیں۔ اس جذبہ کے تحت انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے' چنانچہ شاعری و ادب کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں میں علمی کام کی بھی ابتداء ہوئی ہے۔

لہٰذا قوم پرست جماعتوں میں ایک تو طبقاتی شعور نہیں ہے۔ بلکہ امیر و غریب' کسان و جاگیردار سب ایک دھرتی کے رہنے والے اور ایک زبان بولنے والے ہیں۔ ان کے ہاں مذہب کے بارے میں کوئی جوش نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں ایک مذہب کے ماننے والے بغیر تفریق کے ایک ہو جاتے ہیں۔

اپنے ابتدائی دور میں' یعنی 50 اور 60 کی دھائیوں میں یہ قوم پرست جماعتیں اعتدال

پسند تھیں ان کے خیالات و نظریات میں انتہا پسندی اور تشدد اس وقت آیا جب کہ ملکی حالات میں تبدیلی آئی' جمہوریت کی جگہ فوجی آمریت آئی' آبادی بڑھی' اور ساتھ ہی میں متوسط طبقے کا سائز بھی بڑھا' اور سرکاری ادارے ان بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی ہوئے' تو اس صورت میں انتہا پسندی اور تشدد دونوں ساتھ ساتھ بڑھے کہ جن کی وجہ سے ملک کی سیاست میں عدم استحکام پیدا ہوا' جب یہ صورت حال ہو تو علیحدگی کا نعرہ لوگوں کے لئے دلکش ہو جاتا ہے۔ انہیں حالات میں بنگلہ دیش آزاد ہوا' اور آج یہی صورت حال پاکستان کو پھر سے درپیش ہے۔

شخصیتیں اور سیاسی جماعتیں

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تقسیم کے بعد سیاسی شخصیتوں نے برصغیر کی سیاست کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستان میں گاندھی اور نہرو کی شخصیات کا اثر و جادو آج تک اس قدر ہے کہ ان کے نام پر لوگوں کو جذباتی طور پر ابھار کر' اس سے سیاستداں فائدہ اٹھا رہے ہیں' اور یہی صورت حال پاکستان میں ہے کہ جہاں قائداعظم کے نام پر سیاسی کاروبار کو خوب چمکایا جا رہا ہے۔ چونکہ ان شخصیتوں نے انگریزی دور حکومت میں تحریک آزادی میں جدوجہد کی اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے عزت و احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔ کیونکہ یہ جنگ انہوں نے سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے لڑی اس لئے ان سیاسی جماعتوں کے بارے میں بھی لوگوں میں اچھے جذبات پیدا ہوئے۔

لہذا تقسیم کے بعد ہندوستان میں کانگرس پارٹی حکمراں جماعت بنی' اور پاکستان میں مسلم لیگ۔ ان دونوں جماعتوں کا یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ ملک کی آزادی میں ان کی کوششیں سب سے زیادہ ہیں' اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہو۔ گاندھی اور نہرو کی شخصیات کی وجہ سے ہندوستان میں کانگرس پارٹی مسلسل انتخابات جیتتی رہی۔ اس کے مقابلہ میں دوسری سیاسی جماعتوں کے سامنے سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی کہ جس کو وہ ان دو کے مقابلہ پر لے کر آئیں۔

اندرا گاندھی کو اگرچہ وقتی طور پر سیاسی شکست ہوئی' مگر فوراً ہی دوبارہ سے وہ سیاسی اقتدار میں آگئی۔ اور کانگرس پارٹی کی صورت حال یہ ہو گئی کہ وہ نہرو خاندان کے بغیر

اقتدار میں آنے کا سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی لئے جب اندرا گاندھی کا قتل ہوا تو بجائے اس کے کہ کانگرس کے تجربہ کار سیاستدانوں میں سے کسی کو برسر اقتدار لایا جاتا انہوں نے ناتجربہ کار راجیو کو اپنا لیڈر بنا لیا۔

راجیو کے قتل کے بعد کانگرس پارٹی کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ نہرو خاندان سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیں اور ایک ایسی روایت کی ابتداء کریں کہ جس میں تجربہ کار اور باصلاحیت راہنما سامنے آئیں۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کانگرس پارٹی میں زبردست اعتماد کی کمی ہے اور اسے یہ بھروسہ نہیں ہے کہ وہ محض اپنے منشور کے ذریعہ انتخاب جیت سکے گی' اسی لئے انہوں نے راجیو کے بعد اس کی کوشش کی کہ اس کی بیوی سونیا کو پارٹی کا لیڈر بنا دیا جائے۔ جب سونیا نے انکار کر دیا تو مجبوراً انہوں نے نرسیما راؤ کو اپنا لیڈر چنا۔ اگرچہ ابتداء میں نرسیما راؤ کو اعتماد نہیں تھا کہ وہ کس طرح سے نہرو خاندان کی گدی پر بیٹھ سکتا ہے مگر آہستہ آہستہ اس میں یہ اعتماد آتا چلا گیا۔

مگر اس اعتماد کو زبردست دھچکا اس وقت لگا کہ جب حالیہ ریاستی انتخابات میں کانگرس پارٹی کو زبردست شکست ہوئی۔ اب ہونا تو یہ چاہئے کہ کانگرس کے راہنما اس شکست کا تجزیہ کرتے' اور پھر نیا لائحہ عمل بناتے کہ پارٹی کی کھوئی ہوئی حیثیت کو کیسے بحال کیا جائے؟ مگر اس کے برعکس ان کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ پارٹی کا وقار بحال کرنے کے لئے پھر دوبارہ سے نہرو خاندان کی طرف رجوع کیا جائے۔ سونیا گاندھی کو سیاست میں لایا جائے اور اگر وہ تیار نہ ہو تو پھر اس کی بیٹی پرینکا گاندھی کو تیار کیا جائے۔

اس پورے عمل میں جو ذہنیت کار فرما ہے وہ یہ کہ لوگوں میں جا کر کام نہیں کیا جائے۔ جماعت کا بحیثیت جماعت کوئی وقار بلند نہیں کیا جائے۔ عوام کے سامنے ان کے مسائل کو دیکھتے ہوئے کوئی نیا منصوبہ یا منشور نہیں لایا جائے۔ اپنی غلطیوں کو دور نہیں کیا جائے۔ اپنی خرابیوں پر نظر نہیں ڈالی جائے۔ بلکہ ان سب سے بچ کر شخصیت کے نام پر لوگوں کے جذبات اور ان کی ہمدردی کو ابھار کر اقتدار میں رہا جائے۔ اگر کانگرس پارٹی نے دوبارہ سے نہرو خاندان کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تو اس صورت میں وہ ہندوستان کی سیاست کو بھی بگاڑے گی' اور خود بھی بحیثیت پارٹی کے بالاخر اپنی حیثیت کو کمزور کرے گی' کیونکہ جمہوری ملکوں میں شخصیتوں کے سہارے یہ ہمیشہ انتخاب نہیں جیتے جاتے' اس کے لئے نئے

منصوبوں اور منشوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکستان میں صورت حال اگرچہ ذرا مختلف ہے، مگر یہاں بھی تقسیم کے بعد مسلم لیگ اسی بنیاد پر اقتدار میں رہی کہ وہ قائداعظم کی وارث ہے۔ چونکہ پاکستان میں ایک طویل عرصہ آمریت رہی اور یہاں انتخابات نہیں ہوئے۔ اس لئے فوجی آمروں نے مسلم لیگ اور قائداعظم کے نام کو استعمال کیا۔ ایوب خاں نے اپنی مسلم لیگ بنائی، اور پھر یہی کوشش ضیاء الحق کے زمانے میں ہوئی، اب اس وقت مسلم لیگ کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر ایک اس کا دعویٰ دار ہے کہ اس کی جماعت اصل ہے۔ نواز شریف کی مسلم لیگ بھی ان ہی دھڑوں میں سے ایک ہے۔ مسلم لیگ کے راہنماؤں کی اب تک دلیل یہ ہے کہ عوام انہیں اس لئے ووٹ دیں کیونکہ وہ قائداعظم کے وارث ہیں۔ اور انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔

مسلم لیگ کے مقابلے میں اب پیپلز پارٹی ہے کہ جس میں بھٹو خاندان کی اجارہ داری ہے۔ اس خاندان نے یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ اگر پارٹی میں ان کی لیڈرشپ نہ ہو تو پارٹی ہی ختم ہو جائے گی۔ چونکہ پاکستان میں اب تک جمہوری روایات مستحکم نہیں ہوئیں ہیں، اس لئے یہاں شخصیت پرستی کے رجحانات بڑے مضبوط ہیں۔ اس لئے ایسا نظر آتا ہے کہ بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی مستقبل میں طویل عرصہ کے لئے لازم و ملزوم رہیں گے۔ اور یقیناً یہ پاکستان میں جمہوری عمل کے لئے زبردست نقصان ہو گا۔

کیونکہ جب بھی کسی سیاسی جماعت پر ایک خاندان کی اجارہ داری ہوتی ہے تو اس سے باصلاحیت افراد کو ابھرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع نہیں ملتے ہیں، اور جس طرح سے کہ شاہی خاندانوں کے لاچار و معذور افراد لوگوں پر حکومت کرتے رہے، یہی صورت حال ان سیاسی خاندانوں کے اقتدار سے ہو گی۔ صحیح جمہوری روایات اس وقت تک مستحکم نہیں ہوں گی جب تک کہ سیاسی پارٹیاں ان شخصیات کی گرفت سے نہیں نکلیں گی اور علیحدہ سے اپنی شناخت کو نہیں ابھاریں گی۔

سیاسی کارکن اور ان کی خدمات

ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کا واقعہ کئی لحاظ سے انتہائی اہم ہے۔ ایک اس لحاظ

سے کہ اس میں دو ایسے طبقے پیدا ہوئے کہ جن کے سیاسی خیالات اور سماجی رویے مختلف تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے 1857ء میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا' دوسری طرف وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے انگریزوں کی مدد کی' اور اس ہنگامے کے دوران ان کی حفاظت کی۔ لہٰذا جب امن قائم ہوا' اور انگریزی حکومت دوبارہ سے مستحکم ہوئی تو انہوں نے اپنے مخالفوں کو چن چن کر سزائیں دیں اور جن لوگوں نے ان کی مدد کی تھی انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔

آزادی کے بعد جب ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے تلاش کر کے ان خاندانوں کو انعامات دئے کہ جن کے آباؤ اجداد نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور انگریزوں سے لڑے تھے۔ ان انعامات کا مقصد قطعی یہ نہیں تھا کہ ان کی خدمات کی قیمت ادا کی جائے بلکہ یہ تھا کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔

اس کے برعکس پاکستان میں جو روایت پڑی وہ یہ تھی کہ تقسیم کے بعد ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی کہ جنہوں نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا ہے' اس کی قیمت وصول کرنی شروع کر دی۔ یہ قیمت جائدادوں کے الاٹ منٹ سے لے کر تمغے اور خطابات تک تھی۔ جب تحریک پاکستان کے کارکنوں کی قیمت متعین ہو گئی تو ہر موقع پرست نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ خود کو کارکن ثابت کرے۔ یا اس کے خاندان والوں نے اپنے آباؤ اجداد کی شرکت کی قیمت وصول کرنی شروع کر دی۔ خود کو تحریک پاکستان کا کارکن ثابت کرنے کے لئے تاریخ کو مسخ کیا گیا' جھوٹے واقعات بیان کئے گئے' یا گھڑے گئے' جعلی شہادتوں کو اکٹھا کیا گیا' اور اس طرح سے نہ صرف مالی فوائد حاصل کئے گئے' بلکہ سیاست میں بھی ایک مقام حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

ابھی تحریک پاکستان کے کارکنوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور روایت پڑی' وہ یہ کہ جب آمریت کے بعد جمہوریت آئی تو مارشل لاء کے خلاف لڑنے والوں اور سختیاں جھیلنے والوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا اور اس بنیاد پر انہوں نے جمہوری حکومت سے مطالبہ کیا کہ انہیں مراعات دی جائیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے کوڑے کھائے تھے' یا جیل گئے تھے' انہیں مناسب ثبوت فراہم کرنے کے بعد انعامات سے نوازا گیا۔

ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے کہ جنہوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تھی۔ ان کا بھی مطالبہ تھا کہ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں معاوضہ دیا جائے۔ چنانچہ آج ہر موقع پرست اس کا دعویٰ کر رہا ہے کہ سب سے زیادہ اس نے مارشل لاء کی مزاحمت کی تھی۔ اس لئے سب سے زیادہ اسے انعامات دیئے جائیں۔

اس تمام صورت حال سے جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کیا جن لوگوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا' یا مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کی تھی کیا یہ مالی منافعت اور فوائد کے لئے تھی یا اس کے پیچھے کوئی مقصد تھا؟ اگر انہوں نے کسی مقصد' سچائی' اور حق کے لئے قربانیاں دیں تو کیا اس کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسا نہیں تھا اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وقت آنے پر وہ اس کی قیمت وصول کریں گے تو ان کی جدوجہد کاروباری ہو جاتی ہے۔

اس سارے ڈرامے کا المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے واقعی کسی مقصد کے لئے جدوجہد کی تھی' وہ پس منظر میں چلے گئے ہیں اور آج بھی خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگ کہ جو کل آمروں کے ساتھ تھے اور ان کی مدد کر رہے تھے آج وہ سب سے زیادہ جمہوریت کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔

جب بھی کسی معاشرے میں یہ صورت حال ہو تو اس کی وجہ سے قابلیت و ذہانت کی قدر نہیں ہوتی ہے اور موقع پرستی کو پھلنے و پھولنے کا موقع ملتا ہے اور ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جاتا ہے کہ جو اپنی خدمات کے عوض حکومتوں سے پوری پوری قیمت وصول کرتا ہے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں ان کے لئے کوئی عزت و احترام نہیں رہتا ہے۔ ایک مرتبہ جب کوئی قیمت وصول کر لے تو پھر معاشرہ بھی ان کو بھلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں یہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی نظریات یا مقاصد کے لئے جدوجہد نہیں کر رہا ہے' بلکہ یہ سب کسی مصلحت یا اپنے فوائد کے لئے مخالفت کر رہے ہیں۔ اس لئے سیاسی مخالفت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں جو خاموشی اور سیاست سے نفرت ہے اس کی جڑیں انہیں روایات میں پوشیدہ ہیں۔

فوج اور سیاست

پاکستان کی سیاست میں فوج کی دخل اندازی کی وجہ سے جمہوری سیاست اور جمہوری عمل کو سخت دھچکا لگا۔ جن حالات میں فوج کو سیاست میں آنے کا موقع ملا اس کی ذمہ داری بھی سیاستدانوں پر آتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد مسلم لیگ اور سیاستدانوں نے جمہوری عمل کو اس طرح سے کمزور کیا کہ انہوں نے نہ تو دستور بنایا اور نہ ہی انتخابات کرائے۔ اس وجہ سے جمہوری اداروں اور روایات کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سازش اور جوڑ توڑ کے ذریعے حکومتیں بدلی گئیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان حکومتوں کے جائز ہونے کی کوئی بنیاد نہیں تھی اور اس وجہ سے نہ ہی یہ عوام میں مقبول تھیں۔ اس کے علاوہ سیاست چند گروہوں میں محدود ہو کر رہ گئی اور اس کا تعلق عوام سے نہیں رہا۔ مزید برآں سیاستداں عوام کے مفاد کے لئے کچھ کرنے میں ناکام رہے۔ اس لئے عوام میں ان کے خلاف برابر بیزاری بڑھتی رہی۔

اس لئے جب ایوب خاں نے سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء کا نفاذ کیا تو عوام میں اس کا خیرمقدم ہوا' کیونکہ اسکندر مرزا خود تو منتخب صدر نہیں تھا اور اس کی برطرفی سے کسی کو صدمہ نہیں ہوا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد جو اقدامات کئے گئے لوگ اس سے بڑے متاثر ہوئے لیکن جلد ہی اس کے منفی نتائج بھی سامنے آنے لگے۔ کیونکہ ایوب خاں فوجی طاقت کے ذریعے آئے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ جو بھی تھوڑی بہت جمہوری روایات اور ادارے ہیں انہیں ختم کر دیا جائے' یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ٹریڈ یونینز اور طالب علم یونینز پر پابندیاں لگائیں تاکہ ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں رہے۔

بعد میں جب انہوں نے اپنا سیاسی جواز تلاش کرنے کی کوشش کی تو سیاسی اداروں کو اس طرح سے تشکیل دیا کہ جو ان کے اقتدار کے لئے خطرہ نہ ہوں' چنانچہ بنیادی جمہوریت کا نظام اس ذہن کی پیداوار تھا۔ اس عمل نے پاکستانی معاشرے کو غیر سیاسی بنانے میں پورا پورا حصہ لیا۔ ایوب خاں کی فوجی حکومت نے خود کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ریاستی مشنری کو پوری طرح سے استعمال کیا' چنانچہ ریڈیو اور اخبارات نے ان کا امیج بنانے کی مہم شروع کی۔ سیاست میں موقع پرستی کی روایت پہلے سے تھی' ایوب خاں نے اس کی ہمت افزائی کی اور کنونشن مسلم لیگ بنا کر اس میں موقع پرست سیاستدانوں کو اکٹھا کر لیا۔

ایوب خاں کی حکومت جس بری طرح ناکام ہوئی اس سے بھی فوج نے کچھ نہیں سیکھا اور یحییٰ خاں نے فوجی حکومت کو تازہ خون دینے کی کوشش کی مگر اس نتیجہ میں مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آیا۔ ضیاء الحق کی فوجی حکومت کئی لحاظ سے بڑی اہم رہی کیونکہ اس کے ملک اور معاشرے پر دور رس نتائج ہوئے۔ کلاشنکوف' ڈرگ' فرقہ وارانہ تعصب' لسانی و نسلی فسادات' اظہار رائے پر پابندی' اور ریاستی مشنری و میڈیا کا اپنی ذات و حکومت کے لئے استعمال یہ چند خصوصیات تھیں کہ جنہوں نے ملک کے حالات بگاڑنے میں حصہ لیا۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ ان کے زمانہ میں فوجی ایجنسیاں سیاسی طور پر انتہائی سرگرم ہو گئیں اور انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بہت سی فرقہ وارانہ اور لسانی اور نسلی سیاسی جماعتوں کی سرپرستی کی۔ اخباروں پر پابندیاں عائد کی گئیں' دانشوروں کو خریدا گیا' اور ان نظریات کو فروغ دیا گیا کہ جو ان کے مفاد میں تھے۔ اس پالیسی کے نتیجہ میں ملک میں ثقافتی سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئیں اور دانشوروں کی بنیادیں مسمار ہو گئیں' ایک ایسا نظام تعلیم بنایا گیا کہ جس نے تنگ نظر اور متشدد نسل کو جنم دیا۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی کہ لوگوں کو سیاست سے دور کر دیا جائے۔ اسی لئے سیاسی جماعتوں پر پابندیاں' اور غیر جماعتی انتخابات کی روایت پڑی تاکہ کسی بھی سیاسی جماعت کی اہمیت اور ضرورت باقی نہ رہے۔

فوجی حکومتوں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہاں اتھارٹی کے استحکام پر زور تھا' اس لئے حزب اختلاف اور مخالفت کی ان کے فریم ورک میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ طاقت کی اس مرکزیت کی وجہ سے جہاں ایک معاشرے میں احساس محرومی کے جذبات پیدا ہوئے وہاں دوسری طرف غلط فیصلوں نے معاشرے کی ترقی کی راہیں مسدود کر دیں' کیونکہ آمرانہ طرز حکومت میں شخص واحد اور اس کے مصاحین فیصلے کرتے ہیں اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلے کریں گے نہ عوام کے لئے بہتر ہوں گے۔ لہذا اس عمل میں لوگ حکمراں طبقے سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں' اور بغیر عوامی مدد اور تعاون کے یہ منصوبے کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ آمرانہ حکومتوں میں ہمیشہ اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی سازش ہو گی اور یہ ڈر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سازش کے ذریعہ اقتدار میں آتے

ہیں' لہٰذا یہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے خفیہ ایجنسیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان ایجنسیوں کی موجودگی کی وجہ سے معاشرے میں خوف و دہشت و ہراس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو لوگوں کی آزادی کو سلب کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

پاکستان کی سیاست پر فوجی حکومتوں کا اثر اس قدر پڑا ہے کہ جمہوریت کی بحالی کے باوجود یہ غیر جمہوری روایات اور ادارے نہ صرف موجود ہیں بلکہ طاقت ور بھی ہیں۔ ان کی موجودگی کسی بھی وقت جمہوری ڈھانچہ کو ختم کر کے ملک کو پھر آمریت کی جانب لے جا سکتی ہے۔

پاکستان اور سیاسی عمل

جمہوری معاشرے میں ہر سیاسی جماعت کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ انتخابات میں کامیابی کیسے حاصل کی جائے؟ اس لئے اپنے ووٹرز کو متاثر کرنے کے لئے وہ ایسے نعروں کا سہارا لیتے ہیں کہ جو لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کر سکیں۔ ابتدائی دور میں انگلستان' فرانس اور دوسرے یورپی ملکوں میں کہ جہاں صرف محدود طبقوں کو انتخابات میں ووٹ دینے کی آزادی تھی وہاں ان کے نعرے اور ان کے منشور ان ہی طبقوں کے مفادات کا اظہار کرتے تھے۔ مثلاً اظہار رائے کی آزادی اور نجی جائداد کا تحفظ وغیرہ' لیکن جیسے جیسے ووٹ کا حق لوگوں کو ملتا گیا اسی طرح سے عوام کی اہمیت بڑھتی چلی گئی' اور سیاسی جماعتیں اپنے منشور میں ایسے مطالبات رکھنے لگیں کہ جن کا تعلق عوام سے تھا۔

پاکستان میں اگرچہ جمہوری سیاست کا دور بہت مختصر ہے' مگر اس عرصہ میں سیاسی جماعتوں نے عوام کو متاثر کرنے کے لئے ایسے نعرے تخلیق کئے ہیں کہ جو انتخابات کے وقت زور شور سے بلند کئے جاتے ہیں' اور ان کے ذریعہ سے لوگوں سے ووٹ لئے جاتے ہیں۔ ان نعروں میں سب سے زیادہ اہم نعرہ "عوام" کا ہے۔ یعنی عوامی حکومت' عوامی معیشت' عوامی بہبود' عوامی سہولتیں' وغیرہ وغیرہ۔ لفظ عوام کے اس قدر استعمال سے عوام کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اصل میں حکومت ان کی ہے اور اس کے ذریعہ حکومت اپنے جائز اور جمہوری ہونے کا سرٹیفکیٹ لیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتداء میں عوام کے نعرے نے لوگوں میں ایک جذبہ اور جوش پیدا کیا' مگر اب تجربہ سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ نعرہ

عوامی ہوتا ہے مگر اس کے پردہ میں امراء' جاگیردار' اور مراعاتی طبقہ اپنے مفادات پورے کرتا ہے۔

ایک دوسرا نعرہ انقلاب کا ہے۔ انقلاب کی اہمیت تاریخ میں فرانسیسی اور روسی انقلاب کے بعد ابھری۔ اس کے بعد سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ انقلاب کے ذریعہ معاشرے کی برائیوں کو بہت جلد درست کیا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے اس وقت کہ جب معاشرے میں بدعنوانیاں اور خرابیاں اپنے عروج کو پہنچ چکی ہوں' اور اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہو' ایسی صورت میں انقلاب تبدیلی کے عمل کو تیزی سے اپنے انجام تک پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کہ جہاں انتشار ہو' اور جہاں افراد و ادارے بدعنوانیوں میں ملوث ہو چکے ہوں' وہاں خیال کیا جاتا ہے کہ صرف انقلاب کے ذریعہ ہی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ بائیں بازو کی جماعتیں اس لئے روس' چین' اور کیوبا میں انقلاب کی کامیابی کے بعد سرخ انقلاب کا نعرہ لگاتی تھیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں مذہبی جماعتوں نے سبز انقلاب کا نعرہ لگایا۔ شاہ ایران کو یہ دونوں رنگ پسند نہیں تھے اس لئے اس نے سفید انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ اگرچہ اب انقلاب کا رنگ ختم ہو گیا ہے اور سیاسی جماعتیں انقلابی تبدیلی اور انقلابی قیادت کی بات کرتی ہیں' مگر آہستہ آہستہ تجربے نے اس نعرہ کو بھی کمزور کر دیا ہے۔

چونکہ برصغیر کے دونوں ملکوں میں غربت و مہنگائی بہت زیادہ ہے' اس لئے سیاسی جماعتوں کے نعروں نے غریبی ہٹاؤ' یا مہنگائی کے خلاف جہاد بھی شامل ہو گئے ہیں۔ پاکستان کی بگڑتی ہوئی صورت حال میں تشدد' ڈرگ' کلاشنکوف کے خلاف نعرے اور امن و امان کو برقرار رکھنے اور قانون کی بالادستی کی باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

سیاسی جماعتیں' ان نعروں کے علاوہ خود کو مقبول بنانے کے لئے ان طریقوں کو بھی استعمال کرتی ہیں کہ جن کی ابتداء جرمنی اور اٹلی میں فاشسٹ جماعتوں نے کی تھی۔ مثلاً پارٹی کے جھنڈے' ان جھنڈوں کے مختلف رنگوں سے پارٹی کی پالیسی کا اظہار' اس کے علاوہ موسیقی' گیتوں' ترانوں' اور دھنوں کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کرنا' خصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے اجتماع کرنا تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ عوام کی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ اور بڑے بڑے جلوس نکالنا تاکہ جماعت کی طاقت کا احساس لوگوں میں پیدا ہو۔

اس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت کے لئے ضروری ہے کہ ان کا کوئی ٹارگٹ ہو۔ جیسے ہٹلر نے اپنے زمانے میں یہودیوں اور کیمونسٹوں کو ٹارگٹ بنایا تھا' اسی طرح سے ہمارے ہاں یہود' نصاریٰ اور ہندو کو ٹارگٹ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ عوام کو جس قدر خطرے کا احساس ہو گا اسی قدر انہیں ایسی جماعت اور ایسی لیڈرشپ کی خواہش ہو گی کہ جو انہیں اس خطرے سے محفوظ رکھ سکے۔ دوسری طرف ملک اور معاشرے کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری بھی ان بیرونی دشمنوں پر ڈال دی جاتی ہے' سیاسی جماعتوں کی باہمی رقابت انہیں دوسرا ٹارگٹ فراہم کرتی ہے' اور یہ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتی رہتی ہیں۔ کسی لیڈر یا جماعت کو عوام میں غیر مقبول بنانے کا سب سے بڑا الزام یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے اور ملک کے مفاد کے خلاف کام کر رہا ہے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کے اس عمل نے عوام میں خاصی مایوسی پیدا کر دی ہے اور یہ مایوسی اس لئے خطرناک ہے کہ اس کی وجہ سے ان کا جمہوریت پر سے اعتماد اٹھ رہا ہے ان کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہے کہ جمہوری عمل کے نتیجہ میں کوئی بھی جماعت جو آج ایک پارٹی میں ہیں' اس کی شکست کے بعد اسے چھوڑ کر صاحب اقتدار پارٹی میں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ جمہوری عمل عوام کے لئے کوئی امید کا پیغام لے کر نہیں آتا ہے۔ ان حالات میں متبادل قیادت کی بات کی جانے لگی ہے کہ ان پرانے سیاستدانوں کی جگہ نئی قیادت کو لایا جائے۔ مگر متبادل قیادت کی جو لوگ باتیں کرتے ہیں ان کے ہاں بھی جمہوریت دشمنی اور آمرانہ خیالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔

پاکستان کی سیاست کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس پورے سیاسی عمل میں عوام بالآخر تھک ہار کر مایوس ہو گئے ہیں۔ ان میں مزاحمت کا جذبہ کمزور ہو چکا ہے' اور اس وقت وہ سیاسی عمل کو خاموشی اوز مایوسی کے عالم میں ایسے دیکھ رہے ہیں کہ جیسے اس سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ عوام کا یہ ردعمل جمہوریت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ریاست اور فرد

خودکشی کو اکثر معاشروں میں ایک جرم سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی اعتبار سے عقیدہ یہ ہے کہ چونکہ خدا نے جان دی لہٰذا یہ اسی کا حق ہے کہ وہ اسے واپس لے' اس لئے جو شخص اس حق کو خود استعمال کرتا ہے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ سماجی اور معاشی لحاظ سے ریاست اس کو اس لئے جرم قرار دیتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ایک صحت مند اور توانا یا ذہین و باصلاحیت شخص سے معاشرہ محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مذہبی و روایتی اقدار دونوں کے نقطہ نظر سے خودکشی جرم مانا جاتا ہے۔

لیکن یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مالی مجبوریوں اور بیروزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرتا ہے تو اس صورت میں اس جرم کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اگر ریاست یہ دعوی کرتی ہے کہ ہر فرد کی زندگی برقرار رکھنے کا اسے اختیار ہے تو اس صورت میں یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے کہ جو کسی کو مجبور کرے کہ وہ اپنے مسائل کا حل اپنی موت میں تلاش کرے۔ اسی طرح سے وہ دوسری سماجی اور ثقافتی اقدار کہ جو افراد کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کرتی ہیں اور بالاخر ان کا نتیجہ خودکشی میں نکلتا ہے' انہیں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں فرد کی آزادی انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر ریاست کسی فرد کو مکمل آزادی دیتی ہے اور اس کے مفادات کو معاشرے سے وابستہ کر لیتی ہے تو اس صورت میں فرد کو زندگی سے لگاؤ اور محبت ہوتی چلی جاتی ہے اور زندہ رہنے کے لئے نہ صرف وہ عملی طور پر سرگرم رہتا ہے بلکہ زندگی کے لوازمات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ایک دوسری صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ کوئی فرد خود کو معاشرے کے لئے بوجھ سمجھنے لگتا ہے اور اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی یا صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اس لئے کچھ فلسفیوں کی یہ تعلیم ہے کہ اگر کوئی فرد

اپنی جسمانی کمزوری' بیماری' یا نقص کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے کہ وہ کچھ کام کر سکے تو معاشرے پر بوجھ بننے سے بہتر یہ ہے کہ اسے مرجانا چاہئے۔ اس کی یوں تو بہت سی مثالیں ہیں' مگر قدیم مصر میں اسکندریہ کی لائبریری کے انچارج نے کہ جو ایک بڑا عالم تھا۔ اس وقت خودکشی کر لی کہ جب اس کی بینائی جاتی رہی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بغیر بینائی کے اس کا وجود اس دنیا میں بیکار ہے۔ کیونکہ ایک عالم کی حیثیت سے اس کا کام لکھنا اور پڑھنا تھا اور جب وہ اس کام کا اہل نہیں رہا تو اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔

اسی دلیل کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کل یورپ میں یہ بحث چل رہی ہے کہ اگر کوئی شخص بہت بوڑھا ہو جائے' بہت سخت بیمار ہو جائے اور اس کی زندگی کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہے تو کیا اس صورت میں اسے یا ڈاکٹر کو یہ حق ہے کہ اس کی زندگی ختم کر دے؟ اس سلسلہ میں یورپ اور امریکہ میں کئی ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ جن میں ڈاکٹروں نے جب مریض کی یہ حالت دیکھی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی اور دواؤں کے سہارے اگرچہ اسے کچھ عرصے کے لئے زندہ رکھا جا سکتا تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا تو اس صورت میں انہوں نے اسے زہریلے انجکشن دے کر ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ اس قسم کے بھی واقعات ہوئے کہ بہت سے وہ مریض کہ جو جان لیوا مرض میں گرفتار تھے یا جنہیں انتہائی تکلیف تھی اور وہ اسے مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اس صورت میں خود انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مرنا چاہتے ہیں۔ کچھ حالات میں خود مریض کے قریبی رشتے داروں نے ان کی خواہشات پر عمل کیا اور کچھ میں ڈاکٹروں نے۔

اگرچہ ریاست کا قانون تو یہ ہے کہ نہ تو مریض کو اپنی جان لینے کا اختیار ہے اور نہ ہی ڈاکٹر کو۔ مگر کچھ مریض جن کے انٹرویو کئے گئے ان کی دلیل یہ تھی کہ انہیں اپنی زندگی برقرار رکھنے یا ختم کرنے کا پورا پورا اختیار ہے اس لئے اگر کسی مرحلے پر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا ہے اور اب اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے ہیں' اور انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ان کی موت قریب ہے تو اس صورت میں یہ ان کا حق ہے کہ وہ اپنی جان لے لیں۔ یہ ان کی شخصی آزادی ہے' جس میں ریاست کی دخل اندازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ جب بوڑھاپے یا کسی اور

وجہ سے مرض لاعلاج ہو جائے تو ایسی صورت میں کیوں ریاست بے انتہا پیسہ خرچ کر کے اسے زندہ رکھے کیونکہ بعض مریض تو اس حالت میں کئی کئی مہینے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی دیکھ بھال اور علاج پر خرچہ آتا ہے جس کے بارے میں سب کو علم ہوتا ہے کہ یہ بیکار جا رہا ہے۔

اس کے جواب میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ایک فرد اپنی صحت اور توانائی کے وقت معاشرے کی ترقی میں حصہ لیتا ہے اپنی محنت' ذہانت اور صلاحیت سے معاشرے کو بہتر بناتا ہے اور اس کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے' تو کیا یہ معاشرے کی ذمہ داری نہیں کہ عمر کے اس حصہ میں کہ جب وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے اور معذور ہو جائے تو اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کی خدمات کا صلہ دے؟ اگر ریاست اس کے برعکس عمل کرتی ہے اور مصیبت و ضرورت کے وقت اپنے لوگوں کا تحفظ نہیں کرتی ہے تو اس صورت میں ریاست اپنی قدر و قیمت کھو دے گی اور اس کی عزت و احترام میں کمی آ جائے گی' کیونکہ اس صورت میں اس کا جو امیج ابھرے گا وہ خودغرضی والا ہو گا' جو اپنے مفاد کے لئے لوگوں کو استعمال کرتی ہے اور جب وقت آتا ہے تو انہیں قربان کر دیتی ہے۔ اس لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس صورت میں فرد اور ریاست کے درمیان رشتوں میں فرق آ جائے گا اور فرد کی ریاست سے جو وفاداری اور وابستگی ہے وہ متاثر ہو گی۔ کیونکہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر وہ مرد کو اپنے لئے استعمال کرتی ہے تو اس کی زندگی کا تحفظ بھی کرے اور اسے برقرار رکھنے کی جدوجہد بھی کرے۔

ریاست اور معاشرہ

عوام اور ریاست کے درمیان گہرا رشتہ ہوتا ہے کیونکہ ریاست کے ادارہ کا وجود عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتا ہے۔ بادشاہت کے زمانہ میں ریاست اور بادشاہت دونوں مل کر ایک ہو گئی تھیں' اور عوام کی فلاح و بہبود کا انحصار اچھے اور روشن خیال بادشاہ پر ہوتا تھا۔ اگر بادشاہ کی جانب سے عوامی بہبود کے لئے اصلاحات کی جاتیں' انہیں امن و امان فراہم کیا جاتا تھا' اور انہیں انصاف مہیا کیا جاتا تھا تو عوام اچھے اور نیک خصلت بادشاہ کے ممنون ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ کی مہربانی ہوتی تھی کہ وہ اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرے' اور ان

کے مسائل کے حل پر توجہ دے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے عوام کی فلاح و بہبود کو نظرانداز کر دیا جائے تو ان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کو مجبور کریں یا اس سے کچھ طلب کریں۔

لیکن جیسے جیسے بادشاہت کا ادارہ کمزور ہوا' اس طرح سے آہستہ آہستہ معاشرے کے مختلف طبقوں کو اقتدار میں شریک ہونے کا موقع ملا یہاں تک کہ جمہوری نظام نے شخصی حکومت کو ختم کر کے لوگوں کی حکومت قائم کی' اس کے ساتھ ہی معاشرے میں ریاست اور عوام کے تعلقات بھی بدل گئے جو شخصی حکومت میں ہوتے تھے۔ اگر عوام کی بہتری کے اقدامات کئے جاتے تھے تو وہ شکرگذار ہوتے تھے' مگر اب یہ اقدامات' اصلاحات اور عوامی بہبود کے لئے کئے جانے والے کام ان کا حق ہو گئے ہیں۔ اب عوام ریاست سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے حقوق کو پامال نہیں کیا جائے اور یہ حقوق انہیں دیئے جائیں۔ اس لئے اگر ریاست عوام کی بہتری کے لئے کچھ کرتی ہے تو یہ اس کی مہربانی نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے۔

ہمارے ہاں اب تک ریاست اور عوام کے درمیان اس رشتہ کو حکمراں طبقے نہیں سمجھ پائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی دور میں اگرچہ ریاست کا ڈھانچہ بدلا گیا اور مغل بادشاہت کی شخصی حکومت تو نہ رہی' مگر نوآبادیاتی حکمرانوں نے ریاست کے ڈھانچہ میں یہ تبدیلی کی کہ جاگیرداروں' پیروں' سجادہ نشینوں اور بااثر خاندانوں کو حکومت میں شریک کرکے انہیں اپنے اور عوام کے درمیان بطور رابطہ قائم کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ان کی سرپرستی کے بغیر حکام اعلیٰ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے سرپرستی کا ایک نظام قائم ہو گیا اور اس میں سفارش پر کام کے لئے ایک اہم وسیلہ بن گئی۔ سرپرستی اور سفارش کے اس کلچر نے عوام میں بے بسی' محتاجی' اور انحصار کے جذبات کو پیدا کیا۔ اور ان کی آزادانہ اور خودمختار شخصیت کو ابھرنے نہیں دیا۔

پاکستان بننے کے بعد اگرچہ ملک نوآبادیاتی تسلط سے آزاد ہو گیا' مگر اس کا ریاستی ڈھانچہ اسی طرح رہا۔ ملک میں چاہے جمہوریت رہی ہو یا فوجی حکومت' ان دونوں صورتوں میں ریاست اور عوام کے تعلقات کشیدہ ہی رہے۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں ریاست عوام سے قربانی' ایثار' اور وفاداری کا مطالبہ کرتی رہی ہے' مگر اس کے عوض میں عوام کو کچھ

نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست اور عوام کے رشتے کمزور ہوتے چلے گئے۔ جب کبھی عوام نے اپنے حقوق کے لئے مطالبات کئے' اور مطالبات پر زور دینے کے لئے ہڑتالیں کی' یا جلسے و جلوس نکالے تو اس صورت میں ریاست کی جانب سے سخت اقدامات کئے گئے' جلسے و جلوسوں پر پابندی' لاٹھی و گولی' اور عوام کے لئے قید و بند' روزمرہ کا معمول بن گیا۔ اس ریاستی تشدد کی وجہ سے عوام کے لئے ریاست ایک دشمن ادارہ بن گئی۔ اور دونوں کے درمیان اختلافات اور شک و شبہات کی گہری خلیج حائل ہو گئی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ریاست ایک ایک کر کے اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑا رہی ہے۔ تعلیم' صحت' تحفظ جان و مال جیسے عام شعبوں میں حکومت کی کارکردگی ختم ہو چکی ہے' لہٰذا معاشرے کی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نجی شعبے میں اسکول کھل رہے ہیں' اسپتال تعمیر ہو رہے ہیں' پرائیویٹ سکیورٹی قائم ہو چکی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ پرائیویٹ سہولتیں ہر ایک کے لئے نہیں ہیں' نجی اسکول و ہسپتال اور سیکورٹی سے صرف وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جن کے پاس پیسہ ہے۔ اس صورت میں جہاں ایک طرف معاشرہ مراعات یافتہ و غیر مراعات یافتہ طبقوں میں بٹ رہا ہے' وہاں دوسری طرف نجی ادارے لوگوں کی ضروریات اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانے میں مصروف ہیں۔

اس صورت حال کی وجہ سے اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ جب ریاست اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہل نہیں ہے تو پھر اسے کیوں ٹیکس دیا جائے اور کیوں اس کے لئے قربانی دی جائے؟ یہی وجہ ہے کہ لوگ ریاست کے ٹیکس دینے میں تردد کرتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ ٹیکس بچائے جائیں۔ کیونکہ ریاست کو جو بھی آمدنی ہوتی ہے اس کا استعمال اب عوام کی فلاح و بہبود کے بجائے حکمراں طبقوں کی عیاشی پر ہوتا ہے' جس کی مثالیں لوگوں کے سامنے آئے دن آتی رہتی ہیں۔ غیر ملکی دورے' دعوتیں' مہنگی کاریں' اور دفتروں کی آرائش۔ جب کہ عوام کے لئے نہ پبلک ٹرانسپورٹ ہے' نہ صفائی ہے' نہ سڑکوں کی مرمت ہے' اور نہ ہی ان کے جان و مال کا تحفظ ہے۔

ان حالات میں ریاست اپنا وقار کھو چکی ہے۔ اور عوام کے لئے اس کے وجود کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں رہی ہے کیونکہ وہ ان کی جیبوں سے پیسے نکال کر انہیں اور زیادہ غریب اور مفلس بنا رہی ہے۔

مفید شہری اور معاشرہ

فرد اور معاشرہ کے حوالے سے یہ سوال بھی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ ان لوگوں کا کیا کیا جائے کہ جو پیدائشی طور پر معذور ہوتے ہیں اور اپنی معذوری اور جسمانی نقائص کی وجہ سے معاشرے کے لئے مفید نہیں ہوتے ہیں؟ تاریخ میں کچھ معاشروں میں اس کا یہ حل نکالا گیا تھا کہ جو بچے معذور پیدا ہوں اور جسمانی لحاظ سے کمزور ہوں' انہیں پیدائش کے فوراً بعد مار ڈالا جائے۔ چنانچہ یونان کی ریاست اسپارٹا میں یہ رواج تھا کہ پیدائش کے بعد ہر بچہ کونسل کے سامنے پیش ہوتا تھا اور وہ اسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرتی تھی کہ اس کی پرورش کی جائے یا اسے ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ اسپارٹا کے دفاع اور اس کی طاقت و قوت کے لئے صرف صحت مند اور طاقتور افراد کی ضرورت ہے۔ بیمار' اور معذور لوگ اس کے لئے بوجھ ہوں گے۔

وقت کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی مسلسل کوشش ہوئی کہ معذور لوگوں کو معاشرے کے لئے مفید بنایا جا سکے تاکہ وہ خود کو ناکارہ نہ سمجھیں اور خاندان یا ریاست کے لئے مسائل پیدا نہ کریں۔ اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہرے' گونگے' یا جسمانی معذور لوگوں کی تعلیم و تربیت پر خوصی توجہ دی گئی اور ترقی یافتہ ملکوں میں ریاست نے ایسے اداروں کی مالی امداد کی کہ جو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر رہے ہیں۔

چنانچہ سائنس اور ٹکنالوجی میں تحقیق کی بنیاد یہ ہے کہ کس طرح سے انسان کو معذور ہونے سے بچایا جا سکے اور اسے صحت مند رکھا جا سکے کیونکہ اسی صورت میں معاشرہ ان کو اپنے مقاصد اور اپنی ترقی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ریاست اُن لوگوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کرتی ہے یا سائنس و ٹکنالوجی کی مدد کرتی ہے تو اس کے نتیجہ میں اسے فائدہ ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ ناکارہ اور بے کار رہنے کے بجائے کام کر کے معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور اس کی ترقی و خوش حالی میں برابر کا حصہ لیتے ہیں۔

پاکستان اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کے لئے یہ سوال اہمیت کا ہے کہ کیا انہیں مجموعی طور پر معاشرے کے افراد کو صحت مند اور تعلیم یافتہ رکھنا ہے تاکہ ان کی توانائی اور

قوت کو استعمال کر کے ترقی کی جائے یا اس مسئلہ کو نظرانداز کر کے ریاست کے اداروں کو جن میں فوج اور بیوروکریسی شامل ہیں۔ انہیں مضبوط بنایا جائے اور ان کی مدد سے لوگوں کو کنٹرول میں رکھا جائے؟ پاکستان میں اس پالیسی کے نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ ہم معذور لوگوں کو مفید شہری بنانے کے بجائے صحت مند اور ذہین لوگوں کو معذور بنانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ جب بیروزگاری ہو گی اور معاشی حالت خراب ہو گی تو لوگ مجبور ہوں گے کہ وہ سستے اور گندے علاقوں میں رہیں' نامناسب غذا کھائیں' اور بیماریوں کے علاج سے محروم رہیں۔ یہی حالات ہیں کہ جو بہت سے نوجوانوں کو جرائم کی جانب لے جاتے ہیں۔ یا منشیات کا عادی بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اس پورے عمل میں معاشرے کے نوجوان بیمار' لاغر' توانائی سے محروم' جاہل' اور بیروزگار ہوتے جا رہے ہیں۔ رہے وہ لوگ کے جو پیدائشی طور پر معذور ہو گئے ہیں' ان کے لئے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان میں اکثر کو لوگ اللہ والا سمجھ کر انہیں کچھ تحفے اور نذرانے دے دیتے ہیں اور باقی لوگ اپنے خاندان کے لئے معاشی و ذہنی بوجھ بن جاتے ہیں۔ اکثر ایک فرد کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے پورا خاندان ذہنی و نفسیاتی دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ ریاست اس سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتی ہے کہ ان لوگوں کو کارآمد شہری بنانے میں مدد کرے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو معاشرہ ان کی توانائی سے محروم رہتا ہے' اور دوسری طرف وہ خاندان کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس خاندان کے افراد کی ذہنی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں اور ان کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کے لئے بوجھ صرف معذور لوگ ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو جسمانی و ذہنی طور پر صحت مند ہوتے ہیں' مگر اپنے سماجی رتبہ کی وجہ سے کام کرنا پسند نہیں کرتے ہیں اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی کمائی کا بڑا حصہ ان کی خدمت میں پیش کریں تاکہ ان کے مقابلہ میں وہ آرام اور عیش کے ساتھ رہ سکیں۔ ان میں جاگیردار' زمیندار' سردار' پیر و صوفی شامل ہیں۔ انہیں جو بھی آمدنی ہوتی ہے اسے یہ غیر ترقیاتی کاموں میں استعمال کر کے ضائع کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے نہ تو معاشرہ کی مالی حالت بہتر ہوتی ہے اور نہ ہی سماجی زندگی میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔

ریاست اور معاشرے کے لئے ہر شہری سرمایہ ہوتا ہے' اگر وہ اس کی صحت' تعلیم و تربیت میں پیسہ لگاتے ہیں تو یہ پیسہ ضائع نہیں ہوتا ہے بلکہ آگے چل کر یہی شہری ریاست کے استحکام اور ترقی میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے ترقی یافتہ ملکوں میں شہریوں کی صحت اور تعلیم پر اس قدر زور دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ معذور لوگوں کو بھی مفید بنانے کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد لے رہے ہیں' آج بریل سسٹم نے اندھوں کو اور سننے کے آلات نے بہروں کو' وھیل چیر کے استعمال نے جسمانی معذوروں کو مفید شہری بنا دیا ہے اور یہ لوگ دوسروں کی طرح نہ صرف اپنے کام خود کرتے ہیں بلکہ مفید پیشوں کو اختیار کر کے معاشرے کی ترقی میں برابر کا حصہ بٹاتے ہیں۔ جب یہ کار آمد شہری بن جاتے ہیں تو ان میں سے معذوری اور محتاجی کے جذبات و احساسات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی میں جو اعتماد اور اطمینان آتا ہے وہ خوش حال اور پرمسرت زندگی کے لئے ضروری ہے۔

معاشرہ اور انسانی توانائی

کسی بھی ملک اور معاشرے کی ترقی' استحکام' اور خوش حالی میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ اس کی انسانی طاقت یا "مین پاور" کو کس قدر استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشرہ چاہے کس قدر ہی سائنٹفک اور ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ کیوں نہ ہو' اس کو منظم کرنے اور اس کو چلانے کے لئے انسانی ذہن اور انسانی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر معاشرے کی تمام انسانی قوت کو استعمال کیا جائے گا تو اس صورت میں معاشرہ متحرک رہے گا' لیکن اگر انسانی طاقت عمل اور غیر عمل میں تقسیم ہو جائے تو اس صورت میں اس کی ترقی بھی غیرمساوی ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وہ تمام افراد جو حرکت کے عمل میں شریک نہیں ہیں' بیروزگار رہیں' اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں' یہ لوگ پھر یا تو پیداوار کی زائد مقدار کو استعمال کر کے اسے ہضم کریں گے اور اگر یہ زائد مقدار نہیں ہے تو زبردستی یہ دوسروں کے حصہ میں شریک ہوں گے اور اس طرح خود بھی ناآسودہ رہیں گے اور دوسروں کو بھی بھوکا رکھیں گے۔

انسانی طاقت کو کس طرح سے استعمال کیا جائے یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ اگر اسے ان کاموں اور منصوبوں میں استعمال کیا جائے کہ جہاں نتائج کچھ نہ نکلیں اور وہ

پیداواری عمل کو آگے نہ بڑھا سکیں تو اس صورت میں یہ توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔

اس تشریح کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہمارے ہاں انسانی توانائی کا استعمال کیسے ہو رہا ہے؟ سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہمارا جاگیردارانہ نظام ہے کہ جس میں اس توانائی کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک زمیندار کی خدمت کے لئے آٹھ' دس ملازم ہوتے ہیں' جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو پانی پلائیں' ہاتھ منہ دھلائیں' بستر ٹھیک کریں' جوتوں پر پالش کریں' اور اس کے چھوٹے چھوٹے احکامات کی تعمیل کریں۔ اکثر اس کی ڈیوڑھی پر پندرہ بیس کسان صبح سے شام تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں کہ وہ جب بھی باہر آئے تو اسے سلام کر لیں اور اس طرح اس کی خوشنودی حاصل کر لیں۔

اس طرح حکومت کے دفاتر میں ہر افسر کی خدمت کے لئے کئی چپڑاسی' اور پٹے والے ہوتے ہیں' جن کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ فائلیں ادھر سے ادھر لے جاتے ہیں اور اس کو چائے و پانی پلاتے رہتے ہیں۔ اکثر لمبے برآمدوں میں ہر افسر کے دفتر کے سامنے اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے یہ لوگ جو صاحب کی گھنٹی کے منتظر رہتے ہیں' بڑا ہی مضحکہ خیز منظر پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد بیروزگاروں کی ایک بڑی تعداد ہے کہ جو ملازمت اور روزی کی تلاش میں اپنی توانائی ضائع کرتے ہیں اور اکثر مایوس ہو کر سستی و کاہلی اور ناامیدی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر شہروں میں ان عورتوں کی ایک بڑی تعداد ہے کہ جنہیں گھروں میں بند رکھا جاتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو محض کھانا پکانے اور گھریلو کام کاج میں لگا دیا جاتا ہے۔

کیونکہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسانی قوت کو تربیت دے کر اسے زمانہ کی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے' کیونکہ اب جسمانی توانائی سے سارے کام نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام تعلیم تشکیل دیا جائے کہ جو افراد کو ذہنی و جسمانی دونوں طرح سے اس بات پر تیار کرے کہ وہ سائنس' ٹکنالوجی' اور سماجی علوم میں کام کر سکیں۔ ہمارے ہاں اس پر اس لئے عمل نہیں ہو رہا ہے کیونکہ تعلیم حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع ہر ایک کو حاصل نہیں ہیں۔ وہ طبقے کہ جن کے پاس وسائل ہیں وہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' مگر ضروری نہیں ہے

کہ ذہانت اور تخلیقی صلاحیت بھی ان کے پاس ہوں' اس لئے وہ لوگ کہ جن کے پاس مادی وسائل نہیں ہیں۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں اور ان کی ذہانت ابھرنے نہیں پاتی۔

انسانی قوت اور توانائی کو کارگر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ متحرک رہے' اگر اس میں ٹھہراؤ آ جائے گا تو اس کے ساتھ ہی سستی و کاہلی پیدا ہو جائے گی' اس لئے ضروری ہے کہ یہ معاشرے کے اداروں کو اس اندازے سے ترتیب دیں اور اس کو اس طرح سے تشکیل کریں کہ جس میں ہر فرد برابر کام میں مصروف رہے' اور اس کو یہ احساس نہ ہو کہ اس کا وجود بے کار ہے' یا اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ کیونکہ جب ہر فرد کام کے عمل میں پوری طرح سے خود کو الجھائے گا نہیں اس وقت تک اس کی کام سے دلچسپی اور یگانگت پیدا نہیں ہو گی' اور اس کے بغیر ترقی کا عمل آگے نہیں بڑھے گا۔

ہمیں اس چیز کو سمجھ لینا چاہئے کہ انسانی قوت اور توانائی کو اگر ضائع کیا جاتا رہا تو معاشرہ اس قدر پس ماندہ ہوتا چلا جائے گا۔ معاشرے میں کام کے کلچر کو پیدا کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک فرد کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ معاشرے کے لئے مفید ہے اس وقت تک اس میں خوداعتمادی اور اپنی عزت کے احساسات نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب کام کا کلچر پیدا ہو جائے گا تو اس صورت میں زمیندار' جاگیردار' سردار' پیر و عہدے دار جو کہ بغیر کام کئے دوسروں کی محنت پر گزارا کرتے ہیں ان کی معاشرے میں عزت نہیں رہے گی اور یہ تمام لوگ معاشرے پر بوجھ بن جائیں گے۔

شخصیات اور نظریات

عظیم شخصیتوں یا ہیروز کی ضرورت حکمراں طبقوں کو ہوتی ہے جو ان کے نام' ان کی شخصیت اور ان کے خیالات و نظریات کی بنیادوں پر اپنے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ان کا مفاد ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کے بارے میں اچھا تاثر عوام میں پیدا کیا جائے۔ ان کی ایمانداری' حق گوئی' سچائی' تدبر' فراست اور دانشمندی کے بارے میں اس قسم کے قصے و کہانیاں مشہور کی جائیں کہ لوگ ان کی عظمت و برتری کے قائل ہو جائیں۔ ایک مرتبہ جب کسی شخصیت کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے اور لوگ اس کی ان صفات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس کے بعد اس کے نام کو استعمال کر کے' یا اس کی جانب سے خیالات کو منسوب کر کے حکمراں طبقے فوائد حاصل کرتے ہیں اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرتے ہیں۔

شخصیت پرستی کا سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہوتا ہے کہ جب بھی نظریات و خیالات کی بات ہوتی ہے تو وہ شخصیت کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مثلاً اس کی مثال ہمارے ہاں اقبال اور قائداعظم سے دی جا سکتی ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں دو قسم کے رجحانات میں' زبردست تصادم اور کش مکش ہے' جو خود کو روشن خیال اور قدامت پرست کہتے ہیں۔ اب جب بھی ترقی پسند' لبرل یا روشن خیال یہ بات کرتے ہیں کہ معاشرے میں جدیدیت کا فروغ ہو' قدیم روایات کو توڑا جائے' جمہوری اقدار کو مقبول بنایا جائے' سیکولر نظریات کا پروپیگنڈا ہو' تو وہ بجائے اس کے کہ ان نظریات کو دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کریں' وہ سہارا لیتے ہیں' اقبال اور قائداعظم کے افکار کا۔ مثلاً اقبال کی شاعری سے ایسے اشعار کو ڈھونڈ کر نکالا جاتا ہے کہ جس سے ان کا نقطہ نظر صحیح ثابت ہو۔ جب یہ بات کی جاتی ہے کہ پاکستان میں سیکولر ازم ہو' اور اسے مذہبی ریاست نہ بنایا جائے' تو قائداعظم کی قانون ساز اسمبلی کی پہلی تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ پاکستان کو اس لئے سیکولر ہونا چاہیے

کیونکہ یہ قائداعظم نے کہا تھا۔

جب اسلام کے ترقی پسند نقطہ نظر کی بات ہوتی ہے تو اقبال کے خطبات سے حوالے لائے جاتے ہیں' اور دلیل دی جاتی ہے کہ کیونکہ اقبال ملائیت کے خلاف تھے' اس لئے اسے رد کر دینا چاہئے' اور اس کی جگہ روشن خیال نظریات کو نافذ کرنا چاہئے۔

دوسری طرف سے اس کے ردعمل میں روایت پسند طبقے اقبال اور قائداعظم کے ان نظریات و افکار کو سامنے لاتے ہیں کہ جو ان کے نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ اقبال کا جدیدیت کے خلاف جہاد' جمہوریت کے بارے میں ان کی تنقید' اسلامی امہ کے اتحاد پر زور' وطنیت کے خلاف ان کا غم و غصہ' عورتوں کی آزادی کے بارے میں ان کے منفی خیالات اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں اعتراضات اسی طرح سے قائداعظم کی تقاریر سے ان حوالوں کو نکالا جاتا ہے کہ جن کے ذریعہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کو ایک مذہبی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اس صورت حال کا ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں میں ذہنی خلفشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان میں سے کون صحیح ہے؟ اس کے جواب میں دونوں جانب سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ دراصل وہ ان شخصیتوں کے صحیح خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس دلیل کے نتیجہ میں جھگڑا یہ شروع ہو جاتا ہے کہ خالص اقبال اور خالص قائداعظم کیا ہیں؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں ہمارے دانشور شخصیتوں کا سہارا لیتے ہیں؟ اس کا آسان سا جواب تو یہ ہے کہ خود یہ دانشور اپنے موقف اور نقطہ نظر کے بارے میں پوری آگہی نہیں رکھتے ہیں' اور نہ ہی یہ ذہنی طور پر اس سے مطمئن ہوتے ہیں' اور نہ ہی ان کا اتنا مطالعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو دلیل کے ذریعہ سمجھا سکیں اور لوگوں کو قائل کر سکیں۔ اس لئے اس کی کو وہ شخصیتوں کے سہارے سے پورا کرتے ہیں اور اپنی بات کو دلیل کے بجائے جذبات کے ذریعہ منوانا چاہتے ہیں۔ اس طرح یہ دانشور حضرات لوگوں کی صحیح راہنمائی کرنے کے بجائے انہیں شخصیتوں کے جال میں پھنساتے ہیں۔

ان کے اس رویہ سے ان کی سہل پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی بات کو سمجھ کر اور محنت کر کے لوگوں تک پہنچائیں وہ یہ آسان طریقہ دریافت کر لیتے ہیں کہ شخصیت کے

نام پر لوگوں سے اپنی بات تسلیم کرائیں۔ لیکن یہ کوششیں اس لئے ناکام رہتی ہیں کہ دو گروپ ایک ہی شخصیت کے دو متضاد نظریات کو سامنے لے آتے ہیں' اور اس پورے عمل میں اصل نظریات پس پردہ چلے جاتے ہیں۔

اس لئے صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ ترقی پسند اور روایت پرست اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتے ہوئے شخصیت کا سہارا نہ لیں' بلکہ دلیل کے ساتھ اپنی بات کو پیش کریں' مثلاً سیکولر ازم کیا ہے؟ اس کی ہمارے معاشرے کو کیوں ضرورت ہے؟ یا دو قومی نظریہ ہماری بقا کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ ریاست کی بنیاد مذہب پر ہو یا قوم پرستی پر؟ وغیرہ۔ اگر بحث نظریات کے درمیان ہو گی تو ان کے پہلو واضح ہو کر سامنے آئیں گے' ان کے مثبت و منفی اثرات کا تجزیہ کیا جا سکے گا' اور یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ آج کے حالات میں ہمیں کن نظریات کو اپنانا ہو گا۔

شخصیت پرستی ہماری ذہنی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کیونکہ جب اس کا جادو و سحر زمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو ذہن انہیں کے بنائے ہوئے فریم ورک میں سوچتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور صرف ایک کام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان شخصیتوں کے نظریات و افکار کی نئی نئی تشریح کی جائے۔ ان کی نئی تاویلات پیش کی جائیں' اور ان کو ہر بار نئے انداز سے پیش کیا جائے۔ اس لئے نئے نظریات کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ شخصیتوں کے بتوں کو توڑا جائے اور آزادانہ طور پر سوچا جائے۔ اس صورت میں ہمارے دانشور معاشرے کی راہنمائی کر سکیں گے۔

عظیم شخصیتیں اور لوگ

ایک امریکہ مورخ نے ٹامس جیفرسن کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے لئے نئے ہیرو بنانا' ان کی تشکیل کرنا' اور ان کے بارے میں حیرت ناک قصے و کہانیاں مشہور کرنا' ایک بڑا دلچسپ عمل ہے۔ لیکن اگر اس قسم کا سلوک ان شخصیتوں کے ساتھ کیا جائے کہ جو ہمارے زمانہ سے بہت عرصہ قبل موجود تھیں اور جن کے بارے میں ہماری تاریخی معلومات انتہائی محدود ہیں تو اس صورت میں ان کی شخصیات کو محیرالعقول بنایا جا سکتا ہے۔ مگر وہ شخصیتیں کہ جو ماضی بعید سے نہیں بلکہ ماضی قریب سے تعلق رکھتی

ہیں اور جن کے بارے میں ہمارے پاس' تاریخی مواد بھی موجود ہے' اگر انہیں انسانوں سے اونچا درجہ دیا جائے اور ان کی انسانی کمزوریوں کو چھپایا جائے تو یہ نہ صرف تاریخ کے ساتھ ظلم ہے بلکہ اس سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا جاتا ہے۔

اس لئے یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کسی بھی معاشرے کو یا معاشرے کے حکمراں طبقوں کو ہیروز کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ اور خصوصیت سے پس ماندہ معاشروں میں تو عظیم شخصیتوں کے بارے میں جو باتیں مشہور کی جاتی ہیں اس کے نتیجہ میں لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف عظیم لوگ ہی ان کی نجات کے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا ایسے معاشروں میں جب لوگوں کی نفسیات میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ صرف عظیم شخصیتیں ان کے دکھ درد کو مٹا سکتی ہیں' ان کے مسائل کو حل کر سکتی ہیں' انہیں بحرانوں سے نکال سکتی ہیں' اور ان کے لئے خوش حال دنیا تعمیر کر سکتی ہیں' تو اس کے نتیجہ میں وہ خود بے عمل ہو کر' ایسی شخصیت کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اب وہ خود سے اپنے مسائل کا تجزیہ نہیں کرتے ہیں' اور نہ ہی ان پر غور و فکر کرتے ہیں' بلکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ان کے مسائل کا تیار شدہ حل لے کر آ جائے اور مزاحمت و کوشش کے بغیر ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

دوسری طرف حکمراں طبقے ان شخصیتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے ان شخصیتوں کی شکل و صورت اور ان کے خیالات حکمراں طبقوں کے مفادات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ شخصیتیں نئی فکر و سوچ اور نئے نظریات کو روکنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ان شخصیتوں کی اصلی شکل روپوش ہو جاتی ہے اور وہ پہلو سامنے آتے ہیں کہ جن کی حکومت کو ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگ کیوں ان شخصیتوں پر ایمان لے آتے ہیں' اور کیوں ان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض افراد میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ مگر ان کے کارناموں کو بعد میں صرف انہیں سے منسوب کرنا' غلط تاریخی شعور کا نتیجہ ہے' کیونکہ ہر کام اجتماعی طور پر کیا جاتا ہے اور اس کی کامیابی میں انہیں سے منسوب کرنا' غلط تاریخی تصور کا نتیجہ ہے۔ مگر ایک فرد کو عظیم بنا کر اس کے ساتھی اپنے مفادات کو پورا

کرتے ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بڑھتا جاتا ہے کہ اس میں کوئی کمزوری تھی ہی نہیں' اسی لئے اگر کبھی ان کی انسانی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھایا جاتا ہے تو لوگوں کو اس پر یقین نہیں آتا ہے۔

ہمارے ہاں یوں تو بہت سی تاریخی عظیم شخصیتیں ہیں' مگر دو شخصیتوں کو ہمارے ہاں عظیم بنا کر ان کے نام پر جو کاروبار ہو رہا ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اقبال اور محمد علی جناح' ہمارے نظریہ کے دو بڑے ستون بن گئے ہیں' اور ان کو حکومت نے اپنا کر ان کے نام پر اپنے کاروبار کو جاری کر رکھا ہے۔ اب اقبال کے نام سے پورے ملک میں کئی ادارے ہیں جو ان پر تحقیق کر کے روزی کما رہے ہیں۔ اب تحقیق اس قسم کے موضوعات پر ہو رہی ہے جیسے "اقبال اور پرندے" "اقبال اور زراعت" "اقبال اور پھول" وغیرہ وغیرہ۔ اقبال کے خاندان نے ان کی ہر چیز کو فروخت کر کے لاکھوں روپیہ کما لئے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد کی کتاب "مظلوم اقبال" میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بچپن میں ان کا جو واکر (Walker) تھا' اسے بھی اقبال کا کہہ کر میوزیم کو فروخت کر دیا گیا۔

اقبال یقیناً ایک بڑے شاعر تھے' مگر شخصیتوں کو ہمیشہ ان کے تاریخی فریم ورک یا ڈھانچہ میں دیکھنا چاہئے' انہوں نے اپنے وقت میں لوگوں کو متاثر بھی کیا' مگر جب یہ وقت گذر گیا تو اس کے ساتھ ہی اقبال بھی نئی ضرورتوں اور نئے حالات میں اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔ افکار و نظریات خاص تاریخی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں' انہیں حالات میں اپنا کردار ادا کر کے یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مرحلے پر اور ہر اسٹیج پر نئے نظریات پیدا کئے جائیں۔

یہی صورت حال قائداعظم کی ہے۔ اب ہر شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ قائداعظم کا ساتھی تھا' لہٰذا اس حیثیت سے اس کی عزت کی جائے اور اسے مالی امداد دی جائے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی کہ جنہوں نے انہیں جلسوں میں دیکھا اور سنا تھا وہ ان کے ساتھی بن گئے ہیں اور اپنے لئے مراعات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

عظیم شخصیتیں نہ صرف حکمراں طبقوں کی ضرورت ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے سہارے پر وہ ہر تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں اور دلیل دیتے ہیں کہ موجودہ نظام ان کا تشکیل

کردہ اور ان کے افکار پر قائم ہے لہٰذا اس سے روگردانی نہیں کرنی چاہئے۔ ان کے نام پر ترقی کے عمل کو روکے رکھتے ہیں' دوسری طرف سے وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو ان شخصیات کے ذریعہ دولت کماتے ہیں' لہٰذا یہ وہ لوگ ہیں کہ جو ان شخصیتوں کو عظیم سے عظیم تر بنانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ انہیں یہ خوف رہتا ہے کہ اگر ان شخصیتوں کا طلسم ٹوٹ گیا تو وہ بیکار ہو جائیں گے۔

شخصیتوں کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ معاشرہ جب تک اُن کی گرفت میں رہتا ہے وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔ اس کی ترقی کا عمل جب ہی شروع ہوتا ہے کہ جب وہ ان عظیم لوگوں کے جادو سے خود کو آزاد کرتا ہے اسی وقت اس کے سامنے ایک نئی دنیا ظاہر ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو تازہ ہوا میسر آتی ہے۔

دشمن کی تلاش

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر معاشرے کو کسی نہ کسی دشمن کی تلاش رہتی ہے۔ ایک ایسا دشمن جو معاشرے کے لئے انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور جس کے وجود سے ملک کی سالمیت کو خطرہ رہتا ہے۔ ایک ایسے دشمن کو نشانہ بنا کر وہ اپنے اندرونی تشدد کے جذبات اور نفرت کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ اپنے معاشرے کی تمام خرابیوں کو اسے ذمہ دار ٹھہرا کر اسے برا بھلا کہہ سکتے ہیں اور اس طرح سے انہیں نفسیاتی طور پر سکون و راحت مل جاتی ہے۔ حکمراں طبقوں کا اس میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دشمن کی موجودگی میں وہ عوامی غم و غصہ سے بچ جاتے ہیں اور ان تمام بدعنوانیوں سے بری الزمہ ہو جاتے ہیں کہ جن میں وہ ملوث ہوتے ہیں، دشمن کی موجودگی کی وجہ سے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور عوام کا اعتماد نہیں مل جاتا ہے۔

یہ دشمن وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال امریکی معاشرہ ہے کہ جہاں اس کے دشمن ہمیشہ ایک نہیں رہے بلکہ ضرورت کے تحت انہیں پیدا کیا جاتا رہا ہے۔ دشمنوں کی تلاش میں امریکی جذبات کا سب سے اچھا اظہار ان کی فلمیں اور مقبول ناولوں سے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے دشمنوں کو لوگوں سے روشناس کراتے ہیں اور پھر ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کو پیدا کرتے ہیں۔

مثلاً امریکہ کی ابتدائی تاریخ میں ان کے یہ دشمن ریڈ انڈین تھے کہ جن کے ملک پر قبضہ کر کے انہوں نے انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کیا اور ان کا قتل عام کر کے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ ذرا بھی مزاحمت کر سکیں۔ لیکن یورپی امریکیوں اور امریکہ مقامی باشندوں کے درمیان اس تصادم میں ریڈ انڈین کو انتہائی ظالم، خوں خوار، اور غیر مہذب بتایا گیا ہے جو کہ یورپی امریکیوں کے لئے خطرے کا باعث تھے۔ اس لئے یہ مقبول عام ناولوں اور فلموں کا موضوع بن گیا۔ اس میں یورپی امریکی یا سفید فام اقوام مظلوم

اور ریڈ انڈین ظالم کی شکل میں ابھرتے ہیں۔ اس لئے جب ان سے انتقام لیا جاتا ہے تو ہر سفید فام کا دل خوشی سے پھول جاتا ہے۔ فلموں میں ہیرو کئی سو کی تعداد میں انہیں قتل کر کے اطمینان سے گانا گاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ وہ شکست خوردہ لوگوں کے جذبات کو جگہ نہیں دیتی ہے۔ ریڈ انڈین کے قتل عام کے تذکرے تو ملتے ہیں مگر ساتھ ہی میں اس کے جائز ہونے کا جواز بھی' اس لئے ان کے قتل عام پر کوئی ماتم کرنے والا نہیں ملتا ہے۔ آہستہ آہستہ امریکہ کے ان مقامی باشندوں کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ ریزرویشن میں بند انتہائی پس ماندگی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اور قطعی اس قابل نہیں رہے ہیں کہ بطور دشمن اب ان کا استعمال کیا جائے' اس لئے اپنے اولین دشمن کو ختم کرنے کے بعد امریکیوں کے دوسرے بڑے دشمن کیمونسٹ تھے۔

چنانچہ کیمونسٹوں کی جو تصویر امریکی فلموں' ناولوں اور سرکاری پروپیگنڈے میں ابھر کر آئی وہ یہ تھی کہ یہ سازشی' دھوکہ باز' پرتشدد' اور جذبات سے عاری لوگ تھے۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح سے امریکی ریاست کو ختم کر دیں۔ لہٰذا یہ موضوع خصوصیت سے جاسوسی فلموں کا پسندیدہ موضوع ہو گیا۔ امریکی کیمونسٹوں سے اس حد تک خوفزدہ رہتے تھے کہ جیسے یہ انسان نہیں ہوں بلکہ خوں خوار درندے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ امریکی نظام اور اس کے مفادات تھے اور وہ اسی طرح سے امریکی عوام کو کیمونسٹ نظریات سے دور رکھ سکتے تھے۔ یہ امریکہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا یہ دوسرا دشمن بھی روس کے سیاسی انتشار کے بعد اوجھل ہو گیا اور انہیں اب تک جو خطرہ تھا اس کا وجود بھی باقی نہیں رہا۔

مگر امریکیوں نے اب اپنے دو دشمن اور تلاش کر لئے ہیں۔ ان میں ایک تو جاپانی ہیں۔ جاپانیوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اقتصادیات میں جو ترقی کی ہے اس سے یورپ اور امریکہ دونوں کو زبردست خطرہ ہو گیا ہے۔ جب امریکی سرمایہ دار نے خود کو جاپانی سرمایہ دار کے سامنے بے بس پایا تو انہوں نے اسے اپنا دشمن قرار دیدیا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ امریکہ کی فلموں میں جاپانی بطور دشمن کے سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن اس بار دشمن میں فرق یہ ہے کہ جاپانی نظریاتی دشمن نہیں بلکہ اقتصادی اور معاشی دشمن ہیں کہ جن کے وجود سے امریکی معیشت کو خطرہ ہے۔ اس لئے جاپانیوں کا جو امیج امریکہ میں ابھر رہا ہے وہ یہ کہ یہ

ٹکنالوجی کے راز چوری کرتے ہیں اور سازش کے ذریعہ امریکی صنعت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

لیکن دوسرے دشمن جو امریکی معاشرے کے لئے خطرہ بنا ہے وہ نظریاتی دشمن ہے' اور یہ اسلامی بنیاد پرست ہیں۔ چنانچہ اس وقت پریس میں سب سے زیادہ پروپیگنڈا ان کے خلاف ہے کہ جو امریکی اور مغربی تہذیب کے لئے ایک خطرہ بن کر ابھر رہے ہیں۔ خصوصیت سے کیمونسٹوں کے ختم ہونے کے بعد امریکی و یورپی معاشرے کی نفرت کا سب سے اچھا نشانہ یہ اسلامی بنیاد پرست ہیں۔ اس آڑ میں امریکہ کے لئے لیبیا' عراق' اور ایران کے خلاف اقدامات کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی میں عرب ملکوں کی بادشاہتوں' اور آمرانہ نظام حکومت کی حمایت کو بھی اس وجہ سے درست قرار دیا جاتا ہے کیونکہ یہ امریکی مفادات کے لئے ضروری ہیں۔

دشمنوں کے خلاف پروپیگنڈے میں ایک بات واضح ہے' امریکہ مقامی باشندے' اسلامی بنیاد پرست اور کیمونسٹ اس کا موثر طریقہ سے شکار ہوئے' مگر جاپان کے خلاف یہ پروپیگنڈا اس لئے موثر نہیں ہوا کیونکہ اس سے ان کے معاشی مفادات جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ جاپان نے بھی اس پروپیگنڈے کا موثر جواب دیا' اس لئے وہ اس کے خلاف دشمنی کے جذبات کا زیادہ اظہار نہیں کر سکے۔

یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دشمنوں کو پیدا کرنے میں ہمیشہ حکمراں طبقوں کے مفادات ہوتے ہیں جب کہ عوام کو اس پروپیگنڈے کے ذریعہ جذباتی طور پر الجھایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس کے ذریعہ حکمراں طبقے وقتی طور پر اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔

دشمنوں کو پیدا کرنے میں صرف امریکی اور یورپی معاشرہ ہی مصروف نہیں رہا' بلکہ یہ روس' اور چین میں بھی ہوا کہ یہاں تمام سرمایہ دار ممالک ان کے دشمن تھے' اور ان کی دشمنی کے جذبات پر وہ بھی لوگوں میں اتحاد پیدا کرتے رہے۔ اور یہی جذبہ ہمارے معاشرے میں بھی ہے کہ ہمیں بھی اپنے مسائل کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لئے کسی نہ کسی دشمن کی ضرورت ہے۔

نام اور تعصب

ہر معاشرے میں طبقاتی تضادات' یا نسلی و لسانی و صوبائی بنیادوں پر اختلافات ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات معاشی و سماجی اونچ نیچ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں' جس کی وجہ سے جماعتوں اور گروہوں میں نفرت و تلخی پیدا ہوتی ہے۔ اسی کے نتیجہ میں یہ ایک دوسرے کو اپنے ناموں سے یاد کرتے ہیں کہ جن سے نفرت ظاہر ہو۔ اس قسم کے اختلافات صرف قوم کے اندر جماعتوں میں ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ قوموں کے درمیان بھی ہوتے ہیں کہ جن میں ایک قوم خود کو دوسری سے برتر اور مہذب سمجھتی ہے۔ مثلاً ایک وقت تھا کہ یونانی خود کو دنیا کی مہذب ترین قوم سمجھتے تھے اور دوسروں کو باربیرین یا وحشی کہتے تھے۔ عرب خود کو افضل سمجھتے ہوئے اپنے ہمسایوں کو عجمی یا گونگا کہتے تھے۔ جب اہل ایران بھی مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنی تہذیب کے آگے عربوں کو حقیر سمجھا۔ خاص طور سے فردوسی کے شاہنامہ میں ان جذبات کا اظہار بھرپور انداز میں کیا گیا ہے۔

اسی روایت پر چلتے ہوئے آج اہل یورپ خود کو ترقی یافتہ اور دوسری اقوام کو ترقی پذیر میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح کی تقسیم میں ترقی یافتہ وہ ہوئے کہ جنہوں نے صنعتی طور پر ترقی۔ لہذا یورپ کے اس معیار پر جب ایشیا و افریقہ کی اقوام نے خود کو جانچا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ صنعتی طور پر یورپ سے بہت پیچھے ہیں اس کی وجہ سے یہ اقوام اپنی تہذیبی اور ثقافتی میراث سے محروم ہو گئیں اور خود کو پس ماندہ سمجھنے لگیں۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ ترقی صرف معاشی ہو کر رہ گئی اور مہذب بننے کے لئے ضروری ٹھہرا کہ آمدنی بڑھائی جائے اور معیار زندگی بلند کیا جائے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب معاشی یا سماجی طور پر ایک جماعت ترقی یافتہ ہوتی ہے تو وہ دوسرے گروہوں کو کوئی نام دے دیتی ہے۔ مثلاً امریکہ کے معاشرے میں جہاں بڑی تعداد افریقی غلاموں کی آئی تھی' چونکہ یہ غلام تھے' محنت مزدوری کرتے تھے' ان کے کوئی حقوق

نہیں تھے' ان کے پاس کوئی طاقت و قوت نہیں تھی' اس لئے انہیں حقارت سے نگر' یا نیگرو کہا جاتا تھا۔ اس حقارت کے پیچھے جو جذبات کارفرما تھے وہ یہ کہ انہیں اسی پس ماندہ حالت میں رکھا جائے۔ کوشش کی جائے کہ ان میں کوئی شعور پیدا نہ ہو' کیونکہ اس صورت میں یہ اپنا سماجی درجہ بلند کر کے برابری کی خواہش کریں گے اور برابری کی صورت معاشی ذرائع کو بھی برابر تقسیم کرنا ہو گا۔ اس لئے مراعات یافتہ سفید معاشرہ انہیں انتہائی پستی میں رکھنا چاہتا تھا اور نگر کہہ کر انہیں یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ تمہارا یہی مقام ہے' اس سے آگے بڑھنے کا تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔

لیکن تاریخ انسانوں کی خواہشوں کے مطابق نہیں رہتی ہے۔ یہ بدلتی رہتی ہے۔ اسی تبدیلی کے عمل میں امریکہ کے افریقی غلاموں میں بھی تبدیلی آئی' تعلیم آئی' شعور آیا' حقوق ملے' تو اس نے ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ معاشرے میں انہیں بھی مساوی حقوق ملیں۔ لہٰذا اب نگر یا نیگرو کی اصطلاح کے خلاف جذبات پیدا ہوئے' لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ اس کی جگہ "بلیک" استعمال کیا جائے گا۔

لیکن بلیک کی اصطلاح بھی جلد ہی حقارت کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی بلیک آبادی میں شعور بھی آیا' تو ان کے لئے اب ایک نئی جدید اصطلاح استعمال کی جانے لگی ہے۔ افریقو۔ امریکن۔ اسی طرح سے امریکی کے مقامی باشندوں کے لئے انڈو۔امریکن استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر سفید فام اقوام جو کہ یورپ کے مختلف ملکوں سے آئیں وہ آئرش۔امریکن' یا انگلش۔امریکن نہیں بلکہ امریکن رہے' اور اس طرح امریکہ کے اصل مالک و اجارہ دار بن گئے۔

دراصل کسی بھی معاشرے میں کہ جہاں لوگوں کے گروپوں میں معاشی فرق ہو گا' اس کے نتیجہ میں سماجی تفریق بھی بڑھ جائے گی۔ اس لئے محض اچھی اور خوشنما اصطلاحوں کے ذریعہ کسی کا سماجی رتبہ نہ تو بڑھایا جا سکتا ہے اور نہ ان کے لئے باعزت مقام پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جرمنی میں جب غیر ملکی مزدوروں کو بلایا گیا تو ان کے لئے "مہمان مزدور" کی اصطلاح استعمال کی گئی' مگر جلد ہی یہ لفظ بے عزتی کا لفظ بن گیا۔ کیونکہ جرمن اس لفظ کو حقارت سے غیر ملکیوں کے لئے استعمال کرنے لگے۔

ہمارے ہاں بھی اس بات کی کوشش کی گئی کہ چپراسی کو قاصد و نائب قاصد کہہ کر اس

کو عزت دیں مگر جب تک اس کی معاشی حالت ابتر رہے گی محض ان الفاظ سے اس کی سماجی حیثیت بلند نہیں ہو گی۔ یہی صورت حال یورپ میں خانہ بدوشوں کی ہے جو جپسی کہلاتے ہیں۔ جب یہ لفظ حقارت کا باعث ہوا تو انہوں نے خود کو مسافر (Traveller) کہلوانا شروع کر دیا۔ مگر اس لفظ کی تبدیلی سے وہ اس تعصب اور نفرت کو دور نہیں کر سکے کہ جو ان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں ہے۔

حقارت کی ان اصطلاحات یا الفاظ کا استعمال یک طرفہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ لوگ یا جماعت بھی کہ جنہیں ان حقیر الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے وہ اپنے مخالفوں کے لئے بھی کوئی نام تراش کر کے اپنی نفرت اور حقارت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح ناموں کا یہ سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔ ان ناموں سے قوموں، جماعتوں، اور گروہوں کے قومی، نسلی، لسانی، اور صوبائی تعصبات کھل کر سامنے آتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان ناموں کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

بوڑھے لوگ

ایک زمانہ تھا کہ معاشرے میں بوڑھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔ بیماریاں اور حادثات زمانہ کے ہاتھوں لوگ نوجوانی ہی میں مرجاتے تھے' اس لئے جو لوگ زندگی کی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے اور بیماریوں سے خود کو بچاتے ہوئے زیادہ عمر کے ہو جاتے تھے' معاشرے میں انہیں بطور ہیرو کے دیکھا جاتا تھا اور ان کی جسمانی و ذہنی توانائی کو سراہا جاتا تھا۔ چونکہ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے انہیں زندگی کا تجربہ ہو جاتا تھا اس لئے بوڑھے اور زیادہ عمر کے لوگوں ہی کو قبیلہ یا برادری کا سربراہ منتخب کیا جاتا تھا اور انہیں سے لوگ صلاح و مشورے کرتے تھے۔ ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ نہ صرف تجربہ میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مزاج میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور اہم فیصلے کرتے وقت یہ لوگ جذبات کے بجائے عقل پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ پرانے زمانے میں پنچائت یا مجلس شورہ یا کونسل کے اراکین بوڑھے لوگ ہوا کرتے تھے۔

بوڑھے لوگوں کے تجربہ سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ اس وقت تک معاشروں میں تبدیلی کا عمل اتنا تیز نہیں تھا جس قدر کہ آج ہے' اس لئے جو لوگ زیادہ عمر پاتے تھے وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گذرنے کے بعد اس قابل ہوتے تھے کہ اپنے تجربات کی روشنی میں رائے دیں اور فیصلہ کریں۔ ایک ٹھہرے ہوئے اور کم رفتار معاشرے میں زیادہ عمر کے آدمی کی وقعت ہوتی ہے۔

لیکن جب معاشرے میں تبدیلی کی رفتار بڑھ جائے اور آئے دن نئی سائنسی و ٹکنالوجی کی ایجادات استعمال میں آنے لگیں تو اس صورت میں لوگوں کی عادات اور رویوں' میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے اور ایک بوڑھے آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا ہے کہ وہ ان تیزی سے ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ دے' اس لئے ان حالات میں معاشرہ کا رویہ بھی بوڑھے آدمیوں کے لئے بدل جاتا ہے' کیونکہ ان کا تجربہ فرسودہ ہو چکا ہوتا ہے اور اس کی روشنی

میں جو صلاح و مشورے دیتے ہیں وہ نئے حالات کے مطابق نہیں ہوتے ہیں۔ لہٰذا صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ نئی تبدیلیوں کی وجہ سے اور نئی تعلیم کی وجہ سے نوجوان نسل بوڑھی نسل سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

برصغیر میں ہمارا معاشرہ اس بحران سے گذرا ہے۔ انگریزی اقتدار کے قائم ہونے کے بعد تک پرانی تعلیم یافتہ نسل معاشرے کے لئے سودمند تھی اور وہ لوگ جو عربی و فارسی پڑھے ہوئے تھے وہ انتظامیہ میں اہم خدمات سرانجام دیتے تھے۔ مگر جب یورپی تعلیم کا رواج ہوا اور انگریزی نے پرانی زبانوں کی جگہ لی تو پرانے نظام کے تعلیم یافتہ' آن واحد میں بیکار ہو کر اپنی افادیت کھو بیٹھے اور نئی نسل جس نے جدید تعلیم حاصل کی وہ اپنے خیالات و نظریات میں ان سے مختلف ہو گئی اور دونوں کے درمیان ثقافت کی خلیج بھی حائل ہو گئی۔ اس نے زندگی کی دوڑ سے پرانی نسل کو پیچھے دھکیل دیا اور اس کے ساتھ ہی بزرگوں کے ساتھ جو عزت و احترام تھا اس میں کمی آتی گئی اور ان کے فیصلوں کو اس لئے چیلنج کیا جاتا رہا کیونکہ وہ زمانہ کے تقاضوں سے مختلف تھے اور نئی نسل کی خواہشات کے مطابق نہیں تھے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی نئی ایجادات نے پرانی نسل کو اور زیادہ پس ماندہ کر دیا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ ایک چیز کے عادی ہوتے ہیں' فوراً ہی دوسری چیز وجود میں آ جاتی ہے کہ جس کو استعمال کرنے سے وہ واقف نہیں ہوتے ہیں' اس لئے ہمارے آج بھی ان بزرگوں کی کمی نہیں کہ جو وی سی آر' کمپیوٹر' اور بجلی کے آلات کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتے ہیں جب کہ ان کے مقابل بچے و نوجوان ان کو بغیر جھجک کے استعمال کرتے ہیں۔

اس لئے معاشرے میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں' اب تعلیمی پالیسی یہ ہے کہ ان تبدیلیوں اور مسائل کے بارے میں پہلے بچوں و نوجوانوں کو آگاہ کیا جائے اور پھر ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے والدین کو تربیت دیں۔ مثلاً ماحولیات کے سلسلہ میں جب یہ پالیسی بنائی گئی کہ کوڑے و کچرے کو علیحدہ علیحدہ رکھا جائے' جیسے کاغذ ایک جگہ' کانچ و شیشہ کی چیزیں ایک جگہ' تاکہ ان کی ری پروسیسنگ میں آسانی ہو' تو اس کی تربیت پہلے طالب علموں کو دی گئی اور پھر انہوں نے اپنے گھروں میں والدین کو بتایا۔

چونکہ نوجوان طالب علم تعلیمی اداروں میں جدید تحقیق سے واقف ہوتے ہیں۔ اس

لئے وہ اپنے والدین اور بڑوں کو اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس لئے ابتداء میں جو رول بوڑھے لوگوں کا تھا' اب وہی رول نوجوان نسل کا ہوتا جا رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں تو یوتھ یا نوجوان ترقی' ذہانت' اور تیز رفتاری کی علامت بن گئے ہیں' اس لئے عام طور سے اب بوڑھے لوگوں کو تو بند دفتروں میں پس منظر میں بٹھا دیا جاتا ہے اور سامنے رہنے والے نوجوان ہوتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تعلیم و تربیت نے آج کے نوجوان میں اعتماد پیدا کر دیا ہے اور وہ مسائل اور بحرانوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہے' مگر اس کے باوجود انتہائی اہم معاملات میں زیادہ عمر اور پختگی کو ہی ترجیح دی جاتی ہے جیسے اب تک جمہوری ملکوں میں سربراہ مملکت کے لئے شرط ہوتی ہے کہ وہ کم از کم 40 سال کا ہو۔ بلکہ سیاست میں تو اب بھی بوڑھے لوگوں کو اولیت دی جاتی ہے اور ان پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ سیاسی معاملات اور ریاستی امور کو اب بھی نوجوانوں کے ہاتھوں دینا خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

موت کے بدلتے نظریات

تاریخی شواہد سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ کے ابتدائی زمانے سے شکاری عہد تک انسان کی موت زیادہ تر حادثاتی ہوا کرتی ہو گی اور شاید ہی کسی فرد کو یہ موقع ملا ہو کہ وہ فطری موت مرے۔ کیونکہ اس زمانہ میں انسان چاروں طرف سے فطری بلاؤں اور آفتوں میں گھرا ہوا تھا اور جسمانی طاقت کے علاوہ اس کے پاس اور دوسرے ذرائع نہیں تھے کہ وہ ان آفتوں سے اپنا پورا پورا تحفظ کر سکے' اس لئے جیسے ہی جسمانی طور پر وہ کمزور ہوتا ہو گا' وہ خود شکار ہو جاتا ہو گا۔ لیکن جب انسان زراعتی معاشرے میں آیا تو یہاں پر اس نے پہلی مرتبہ اپنی عمر کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا' اور پہلی مرتبہ اس نے بچپن' جوانی' اور بوڑھاپے کے مرحلوں کو دیکھا۔ مگر اس عہد میں بھی ان تینوں مرحلوں کے بارے میں جو خیالات تھے وہ آج سے مختلف تھے۔ مثلاً ایک عرصہ تک 40 سال کے بعد زندہ رہنے والا خود کو بوڑھا سمجھنے لگتا تھا اور بہت کم لوگ تھے جو اس سے زیادہ بیماریوں اور دوسری آفتوں کا مقابلہ کر کے زندہ رہ سکتے تھے۔ زراعتی معاشرے میں چونکہ انسانی فطرت سے جڑا ہوا تھا' اس لئے اس کے نزدیک موت بھی فطرت کا ایک حصہ تھی' جیسے ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے' اسی طرح سے ایک فرد کی موت کے بعد اس کی جگہ دوسرے افراد لے لیتے ہیں۔ موت فطری ہونے کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کا باعث نہ تھی۔ بلکہ کچھ معاشروں میں تو جب بوڑھے لوگ اس قابل نہیں رہتے تھے کہ اپنی روزی خود پیدا کر سکیں تو وہ جنگلوں' بیابانوں و صحراؤں میں جا کر خود کو فطرت کے حوالہ کر دیتے تھے اور بھوک و پیاس سے دم توڑ دیتے تھے۔

جب معاشروں میں مذہبی عقائد آئے تو اس کے ساتھ ہی موت کے بارے میں نئے خیالات پیدا ہوئے۔ ایک تو موت کے بارے میں یہ تصور عام ہوا کہ یہ دیوتاؤں کی جانب سے آتی ہے اور ایک ہی سزا ہے۔ جب انسان بیمار ہوتا ہے اور اس کا جسم کمزور ہوتا ہے

تو اس کا مطلب ہے کہ اسے الٰہی قوت کی جانب سے سزا دی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ تک وباؤں کو قہرالٰہی سمجھا جاتا تھا' کہ جن میں ہزارہا افراد موت کا شکار ہوتے تھے۔ سزائے موت کی ابتداء بھی اسی نظریہ سے ہے کہ جو بھی شخص معاشرے میں کسی جرم اور گناہ کا مرتکب ہو' تو پھر اسے موت کی سزا دے کر' اس کے جرم اور گناہ کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔

مذہبی عقائد کے ساتھ ہی یہ نظریہ بھی آیا کہ موت کے ذریعہ فرد کی جسمانی زندگی کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے' مگر اس کی روح زندہ اور باقی رہتی ہے' اس لئے موت صرف ظاہری شکل کو ختم کرتی ہے' مگر باطنی زندگی باقی رہتی ہے۔ آگے چل کر روحانی اور جسمانی تصورات نے فلسفہ و مذہب کے ارتقاء میں بڑا حصہ لیا اور یہ اہم مسئلہ بن گیا کہ کیا فرد اور معاشرے کو مادی طور پر ترقی کرنی چاہئے یا روحانی طور پر اپنے درجہ بلند کرنے چاہئیں؟ قرون وسطی میں کہ جب تک مذہبی عقائد مضبوط تھے انسان خود کو موت کے سامنے مجبور اور لاچار پاتا تھا۔ ساتھ ہی میں موت کے بارے میں اس میں ڈر اور خوف پیدا ہو گیا کہ اس کے بعد انسان کو اس کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ لہٰذا موت کے اس ڈر اور خوف کی وجہ سے کچھ لوگ معاشرے کے پیداواری عمل سے کٹ گئے اور اپنی پوری زندگی عبادت و ذکر میں گذار دی تاکہ موت کے بعد سزاؤں سے بچ جائیں۔ وہ لوگ بھی کہ جو پیداواری عمل میں شریک تھے انہیں مذہبی علماء موت سے برابر ڈراتے اور دھمکاتے رہے۔ اور ہدایت کرتے رہے کہ وہ زندگی کی نعمتوں اور لذتوں سے دور رہیں۔

جدید دور میں سائنسی ایجادات اور سماجی و فلسفیانہ نظریات کے مقابلہ میں جب مذہبی عقائد کمزور ہوئے تو اس کے ساتھ انسانی معاشرے میں موت کے بارے میں پھر تبدیلی آئی اور یہ ایک بار پھر ایک فطری عمل ہو گیا' مگر اس بار انسان نے موت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے اس کے خلاف جدوجہد کا راستہ اختیار کیا' اور وہ یہ کہ موت پر کس حد تک قابو پایا جائے۔ اس جدوجہد میں اس نے بیماریوں کے بارے میں تحقیقات کیں' ان کے علاج دریافت کئے' اور اس بات کی کوشش کی کہ جسم کو کس طرح سے صحت مند رکھا جائے' کون سی غذائیں استعمال کی جائیں' اور کون سی ورزشوں کے ذریعہ جسم کو چاق و چوبند رکھا جائے۔

انسان کو اب اس کا بھی اندازہ ہے کہ ایک مرحلہ کے بعد انسانی جسم کمزور ہو جاتا ہے

اور پھر موت کا آنا لازمی ہے اس لئے اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں منصوبہ بندی کر سکے اور زندگی میں اس کے جو عزائم ہیں انہیں وقت پر پورا کر سکے۔

موت پر قابو پانے کی غرض سے انسان اپنے جسم پر زیادہ توجہ دینے لگا ہے' جوانی تک کہ جب اس کے جسم میں توانائی اور تروتازگی ہوتی ہے' اسے جسم کے بارے میں زیادہ فکر نہیں ہوتی ہے' مگر بوڑھاپے میں جب جسم کمزور ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی توانائی میں فرق آتا ہے' اس لئے اب سائنسدانوں کی یہ کوشش ہے کہ کس طرح سے بوڑھاپے کے عمل کو روکا جا سکے۔ جب انسان کا جسم توانا اور تروتازہ رہتا ہے تو وہ فطرت اور دنیا کی نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور جب موت کے بارے میں اسے یہ یقین ہو جائے کہ یہ فطری ہے تو پھر اسے اس کا ڈر اور خوف بھی نہیں رہتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان موت کو قبول کرتا ہے مگر وہ موت کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور یہی وجہ جذبہ ہے کہ انسان ایسے کام کرنا چاہتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہے۔ فلاحی و رفائی کاموں' اور ادب کے شہ پاروں کی تخلیق کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ بادشاہوں اور امراء کی بنائی عمارتیں ان کے نام کو باقی رکھتی ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ موت کے بعد کچھ لوگ نیک نام ہوتے ہیں' اور کچھ پر ہمیشہ لعنت بھیجی جاتی ہے۔

کچھ دانشوروں کے حوالے سے

پاکستان میں دو قسم کے دانشور ہیں: ایک وہ جو کہ رائج شدہ روایات اور موجود اداروں کی حمایت کر کے ان کا اخلاقی اور قانونی جواز پیدا کرتے ہیں اور اس طرح سے حکمراں اور مراعات یافتہ طبقوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں' دوسرے وہ دانشور ہیں' اور جن کی تعداد بڑی محدود ہے' کہ جو فرسودہ' مضمحل' اور قدیم روایات سے بغاوت کر کے' معاشرے کے جمود کو توڑنا چاہتے ہیں۔

روایت پسند دانشوروں کی سرپرستی حکمراں طبقوں کی جانب سے کی جاتی ہے' جب کہ روشن خیال اور ترقی پسند دانشوروں کے خیالات و نظریات کو دبا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں ان دانشوروں کے لئے اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے ذرائع انتہائی محدود ہوتے ہیں' جب کہ قدامت پرست لکھنے والوں کے لئے ذرائع ابلاغ عامہ سے لے کر نصاب کی کتابوں تک اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔

جب ریاست کا کنٹرول ذرائع ابلاغ عامہ اور نصاب کی کتابوں پر ہو تو یہ ان کی مدد سے لوگوں کا ایسا ذہن بناتے ہیں کہ دوسرے افکار کو اپنانے اور انہیں برداشت کرنے کے مواقع کم سے کم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں روشن خیال دانشور کو نظریاتی دشمن قرار دے کر اسے ملک و قوم کے مفادات کے لئے انتہائی خطرناک قرار دیدیا جاتا ہے' جس کی وجہ سے عام لوگ ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے یا اس کی باتیں سنتے ہوئے گھبراتے اور ڈرتے ہیں۔ یہ تو نفسیاتی حربے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ریاست کتابوں پر پابندی لگانے' اور قوانین کے ذریعہ اظہار رائے پر پابندیوں کے ہتھیاروں کو بھی استعمال کرتی ہے۔ ان حالات میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے دانشور گمنامی کی زندگی بسر کر دیتے ہیں' اور ان کی کتابیں ردی ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرے ترقی پسند اور روشن خیال دانشوروں کے نظریات و

افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے' اور نہ ہی وہ تبدیلی کے عمل سے گزرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ تبدیلی کا عمل اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس میں ان صدیوں پرانی روایات کو تہس نہس کرنا ہوتا ہے کہ جن کی تعمیر میں کئی نسلوں نے حصہ لیا ہوتا ہے۔ اور جو معاشرے کی زندگی میں پیوست ہو کر اس کا اٹوٹ انگ ہو جاتی ہیں' ان روایات کے ٹوٹنے کے نتیجہ میں معاشرہ انتشار کا بھی شکار ہوتا ہے' اس لئے لوگوں کو ذہنی طور پر اس انتشار اور پراگندگی سے ڈرا کر انہیں مستحکم شدہ روایات کا قیدی بنایا جاتا ہے۔ اور جو بھی تبدیلی کی بات کرتا ہے' اسے ملکی سالمیت و استحکام کا دشمن قرار دیدیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان میں دانشوروں اور شخصیات کو ان کے نظریوں اور ان کے سیاسی جھکاؤ کی بنیاد پر جانچا' پرکھا' اور دیکھا جاتا ہے' دائیں اور بائیں بازوؤں والی شخصیات ایک دوسرے کی مقابل' حریفوں اور دشمنوں کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں' نظریات کی انتہا پسندی کی وجہ سے ہر گروپ اپنی شخصیات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور انہیں ان کی کم مائیگی کے باوجود علامہ' فلسفی' شاعر عظیم بنا دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے تعصبات اور نفرت کی وجہ سے ہر جماعت اپنی حریف جماعت کے افکار و خیالات کو برا کہہ کر ان سے دور ہو جاتی ہے' اس انتہا پسندی کا شکار شخصیتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ کہ جن کا صحیح مقام نفرت و محبت کی وجہ سے متعین نہیں ہو پاتا ہے یا تو ان کو ہیرو بنا دیا جاتا ہے اور یا انہیں بالکل پستی میں گرا کر ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ نظریات کی اس حریفانہ کش مکش میں یقیناً ایسے دانشور کامیاب رہتے ہیں کہ جن کے ہاں دائیں و بائیں دونوں جماعتوں کو اپنی پسند کی باتیں مل جاتی ہیں' اس کی ایک مثال اقبال کی ہے کہ جنہیں دونوں اپنا سمجھتی ہیں۔ اور جو حکمراں طبقوں میں بھی اتنے ہی مقبول ہیں کہ جتنے ترقی پسند حلقوں میں' اب معلوم نہیں کہ ان میں کون دھوکہ کھا رہا ہے۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک دانشور کا کوئی کمٹ منٹ ہونا چاہئے یا ایسے ہر ایک کو خوش رکھنا چاہئے؟ میرا خیال ہے کہ ایسے شاعروں کا کلام خوش آواز گلوکاراؤں یا گلوکاروں کی آواز میں سن کر تفریح کا سبب تو ہو سکتا ہے' مگر یہ ذہن کے دریچوں کو کھولنے میں ناکام ہوتا ہے۔

کسی بھی معاشرے کی کم مائیگی اور پستی کا اظہار اس کی شخصیت پرستی سے ہوتا ہے'

کہ جہاں شخصیات عظیم ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں معاشرہ کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے شخصیات کو عظیم بنا کر اور ان کے نقش قدم پر چل کر یہ اپنے نقش قدم کو مٹا دیتے ہیں اور اس طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو دیتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب تک فیض کو نہ تو فلسفی بنایا گیا اور نہ ہی عظیم اور گریٹ کا اضافہ ان کے نام کے ساتھ ہوا ہے' جب تک فیض' فیض رہیں گے ان کا رشتہ لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ جس دن وہ عظیم ہو جائیں گے تو لوگوں سے کٹ کر ان سے دور ہو جائیں گے اور ان کی باتیں بھی ان لوگوں کی سمجھ سے بالا تر ہو جائیں گی۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم فیض کی شخصیت' ان کے فن اور شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ریاستی حکمرانوں نے ابتداء ہی سے فیض کی شخصیت کو متنازعہ بنا دیا تھا اور وہ ترقی پسند ہونے کی وجہ سے ریاست اور اس کے استحکام کے لئے خطرہ ہو گئے تھے۔ جب انہیں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا گیا تو وہ ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ سازشی اور باغی بھی ہو گئے۔ لہٰذا اس کے بعد سے ان کی شاعری کو ریاستی ذرائع ابلاغ اور نصاب کی کتابوں سے نکالنا آسان ہو گیا' کیونکہ ایسے ملک دشمن شخص کے خیالات نوجوان نسل کے ذہنوں کو بگاڑ سکتے تھے۔

اور اگرچہ فیض کی وفات کے بعد اس بات کی کوشش ضرور ہوتی کہ انہیں بھی قومیا لیا جائے مگر سرکاری حلقوں کو فیض کے ہاں ایسے اشعار نہیں ملے کہ ٹی۔ وی کے پردہ اسکرین پر دکھائے جا سکیں' اس لئے آخر میں انہیں ہی فیصلہ کرنا تھا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد سے فیض اور ان کی شاعری کا تعلق یا تو کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ سے رہا ہے اور یا موسیقی کی محفلوں کے ذریعہ کہ جہاں ان کے کلام کو گایا گیا' موجودہ زمانہ میں کیٹس نے بھی ان کے کلام کو مقبول بنانے میں حصہ لیا مگر ان محدود ذرائع کی وجہ سے فیض کی شاعری بھی محدود رہی۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض شاعری کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ شاعری انسانی جذبات کو ابھار کر ان میں تلاطم تو پیدا کرتی ہے' اس کے ذریعہ احساسات تو پیدا ہوتے ہیں' اور ذہن سوچنے و غور کرنے پر تیار تو ہوتا ہے' مگر اس

کے ساتھ ساتھ عقلی و سائنسی بنیادوں پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے' اور جب تک یہ دونوں نہیں ملیں۔ اس وقت تک معاشرے میں پختگی اور شعور نہیں آتا ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ دانشور اور عملی کارکن کے درمیان گہرا رابطہ اور رشتہ نہیں ہے۔ دونوں علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دانشور کے افکار معاشرے کے ذہن کو سوچنے اور غور و فکر کرنے پر تیار تو کر دیتے ہیں۔ مگر ان کو عملی جامہ پہنانے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ عملی کارکن یا سیاستداں بغیر فکر اور نظریہ کے اقتدار کے حصول کی جنگ لڑتے ہیں۔ اور اقتدار میں آنے کے بعد ان کے سامنے کوئی منصوبہ اور لائحہ عمل نہیں ہوتا ہے کہ جس کے ذریعہ سے وہ معاشرے کو تبدیل کر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اس کی تشکیل کریں۔ اس طرح دانشور کی دنیا تخیلی رہ جاتی ہے اور سیاستداں بے مقصد اقتدار کی جنگ میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

جب سیاست کی بنیاد فکر پر نہ ہو تو وہ انتہا پسندی کا شکار ہو کر پر تشدد ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں جمہوری روایات اس وقت مستحکم ہوتی ہیں کہ جب فکر و عمل یک جا ہوں۔ اگر یہ دونوں جدا ہوں گے تو معاشرہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ایک دوسرے سے اجنبی رہے گا۔

فیض پاکستان کی تاریخ کے جس دور سے گزرے' وہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ پاکستان نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ اور یہ زمانہ اس کی تعمیر کا زمانہ تھا کہ جب معاشرے میں جمہوری اقدار مضبوط ہوتیں۔ محروم طبقوں کو بنیادی ضروریات ملتیں۔ استحصال' رشوت و بدعنوانی کا خاتمہ ہوتا' اور نفرت و تعصبات کی جگہ رواداری و روشن خیالی کو فروغ ملتا' مگر آزادی کے بعد جن لوگوں نے اقتدار سنبھالا انہوں نے ملک کو انتہا پسندی کی راہ پر شروع سے ہی ڈال دیا۔ اس لئے فیض کے لئے یہ وہ صبح نہیں تھی کہ جس کی محروم لوگوں کو امید تھی' مگر اسی لئے ان کی شاعری میں ایک ایسی صبح کے لئے جدوجہد کا جذبہ ہے' ایک امید کا پیغام ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ جب عوام میں شعور آئے گا۔ ان میں جذبہ اور ولولہ پیدا ہو گا۔ اور جب عوام بیدار ہوں گے تو پھر تخت و تاج گرائے جائیں' اور لوگوں کو ان کے حقوق ملیں گے۔

مگر موجودہ زمانے میں وہ لوگ کہ جو تخت و تاج گرانے کی باتیں کرتے تھے' اور جو استحصال اور ظلم کے خلاف نعرے لگاتے تھے' اور جو ترقی پسند قوتوں کے راہنما تھے' آج

وہی لوگ تخت و تاج کے حلیف اور استحصالی و ظالم لوگوں کے مصاحب بن گئے ہیں اور فیض ہی کی زبان میں کہنے لگے ہیں کہ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

پاکستان کی تاریخ کا یہ زمانہ ترقی پسند راہنماؤں کی بدعہدی کا زمانہ ہے کہ جنہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر کے لوگوں کو مایوس و ناامید کر دیا ہے' اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ کیا فیض کی شاعری ان حالات میں ہماری کوئی راہنمائی کرے گی؟ یا فیض کو ابھی اور انتظار کرنا ہو گا۔

عیسائی مشنری اور مناظرے

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمان علماء اور عیسائی پادریوں کے درمیان ہونے والے مناظروں کی ابتداء اکبر کے عہد سے ہوئی' اور پھر جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو ان مناظروں میں بڑی شدت آ گئی۔ مگر اکبر کے عہد کے مناظروں اور ایسٹ انڈیا کے زمانے میں ہونے والے مناظروں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق سے ہم مسلمان معاشرے کی ذہنی پختگی اور ردعمل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اکبر نے جب مذہبی مباحث کے لئے عبادت خانہ کی بنیاد رکھی تو ابتداء میں اس میں مسلمانوں کے مذہبی فرقے حصہ لیتے تھے' بعد میں ہندو' بدھ' جین' زرتشت کے ماننے والے ان مباحثوں میں شامل ہو گئے۔ 1579ء میں اکبر نے گوا سے عیسائی پادریوں کا ایک مشن منگوایا کہ جو اسے عیسائی مذہب اور اس کے عقائد کے بارے میں معلومات فراہم کریں اور ساتھ ہی میں دربار میں علماء سے بحث و مباحثہ کریں۔ جب یہ مشن اکبر کے دربار میں آیا ہے تو یہ اپنے ساتھ بائبل کے عبرانی' کلدی' لاطینی' اور یونانی زبانوں کے نسخے ساتھ میں لایا۔ اس وقت مغل دربار میں بائبل کا کوئی نسخہ' کسی بھی زبان میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کا عربی و فارسی ترجمہ ہوا تھا۔ اس لئے دربار کے علماء بائبل سے بالکل واقف نہیں تھے اور اس کے بارے میں ان کی معلومات اسی حد تک تھیں کہ جو معلومات اسلامی کتب میں تھیں۔ اس کے مقابلہ میں یورپ میں 1143ء میں روبرٹ کٹون نے قرآن شریف کا ترجمہ لاطینی زبان میں کر لیا تھا جس کی وجہ سے آنے والے مشنری اس سے پوری طرح سے واقف تھے۔ اسی وجہ سے جب عبادت خانہ میں علماء اور پادریوں کے درمیان بحث ہوئی تو اس میں علماء نے خود کو بے بس پایا اور پادریوں کے اعتراضات کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکے۔ لہٰذا جب دلیل کے ساتھ بات نہیں بنی تو ایک موقع پر ایک عالم شیخ قطب الدین نے پادریوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ آگ کا ایک الاؤ دھکایا جائے۔ میں قرآن

شریف ہاتھ میں لے کر اور میرا مقابل انجیل کو لے کر آئے اور ہم دونوں آگ سے گذرتے ہیں۔ جو صحیح سلامت نکل آئے گا اسی کا مذہب حق پر ہو گا۔ یہ کہہ کر شیخ نے اپنا ہاتھ پادری ایکو اویوا کی کمر میں ڈال کر کہا "بسم اللہ۔" اس پر اکبر نے شیخ سے کہا کہ بات خلاف عقل ہے اور دین کی سچائی کی دلیل نہیں ہے۔

پادریوں کے یہ مشن اکبر کے زمانے سے لے کر جہانگیر کے زمانہ تک آئے۔ اس دوران میں 1609ء میں بائبل کا فارسی ترجمہ جہانگیر کو پیش کیا گیا اور 1671ء میں اس کا عربی ترجمہ بھی ملنے لگا۔ علماء سے بحث کے لئے پادریوں نے فارسی زبان سیکھی۔ اس وقت تک پادریوں کا خیال تھا کہ اگر بادشاہ کو عیسائی بنا لیا جائے تو اس صورت میں پورا ملک عیسائی ہو جائے گا۔ لیکن جب اکبر اور جہانگیر نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تو مشنریوں کا جذبہ بھی ٹھنڈا ہو گیا اور ان کی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔

ان مناظروں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ مغل سلطنت' سیاسی طاقت کی وجہ سے اپنے عروج پر تھی مگر علماء اپنی مذہبی معلومات میں انتہائی پس ماندہ تھے اور سیکولر علوم مثلاً ریاضی' فلسفہ' منطق اور تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ دلائل کے بجائے وہ جذبات کا سہارا لیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس جو سیاسی قوت و طاقت ہے وہ ان کی پشت پناہی کرے گی اس لئے انہیں علم کا نہیں بلکہ طاقت کا بھروسہ تھا۔ ان مناظروں میں انہیں جو چیلنج ہوا اس کے باوجود انہوں نے اپنے مذہب کے دفاع کی طرف توجہ نہیں دی۔ بائبل کا فارسی اور عربی ترجمہ عیسائی پادریوں نے کیا' علماء نے نہیں۔ اور نہ ہی انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اسلام پر جو اعتراضات ہیں ان کا فوری جواب دیا جائے۔

لیکن جب مغل خاندان کا زوال ہوا اور کوئی سیاسی طاقت ان کو سہارا دینے والی نہیں رہی تو اس موقع پر ان کا ردعمل مختلف تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے زمانہ میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں بڑھ گئیں کیونکہ اس وقت انتظامیہ اور مشنریوں میں یہ خیال تھا کہ اگر ہندوستان کے لوگ عیسائی ہو جائیں گے تو ان کی حکومت مستحکم ہو جائے گی۔ سرسید احمد خاں نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں لکھا ہے کہ "1855ء میں پادری ایڈمنڈ نے ـــــ سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب

تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی' ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہو گئی' مذہب بھی ایک چاہئے' اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ہو جاؤ۔"

اس زمانہ میں جو مشنری آئے انہوں نے تبلیغ کے لئے عربی' فارسی' اردو اور دوسری ہندوستانی زبانیں سیکھیں' مذاہب کا مطالعہ کیا' اور تاریخ پڑھی' اور عیسائی مذہب کی حقانیت کے بارے میں انہوں نے مناظروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانہ میں ایک جرمن عیسائی مبلغ جس کا نام ہمفانڈر تھا وہ ہندوستان آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان حکومتیں زوال پذیر ہیں جب کہ ان کے مقابلہ میں مغربی تہذیب عروج پر ہے' لہٰذا ان حالات میں مسلمان امراء' علماء' اور اشراف اور پھر عوام مذہب سے بیزار ہوں گے' اپنے مذہب پر شک کریں گے اور آخر میں عیسائی ہو جائیں گے۔ اس کا یہی خیال ہندوؤں کے بارے میں تھا کہ وہ بھی عیسائی ہونے کے لئے تیار ہیں۔ کیونکہ ان کی اقدار زوال پذیر ہیں۔

اس بار عیسائیت کا چیلنج مسلمان علماء کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس بار انہیں مذہب کا دفاع دلیل اور علم کی بنیاد پر کرنا تھا' سیاسی سرپرستی اس بار عیسائی مشنریوں کے پاس تھی۔ لہٰذا انہوں نے بائبل کے ان ترجموں سے فائدہ اٹھایا کہ جو عیسائیوں نے مذہبی تبلیغ کے لئے کئے تھے۔ اس مرتبہ ان مناظروں میں دلیل پر زیادہ زور دیا گیا اور غصہ' لعن طعن اور گالی گلوچ کم ہوتی گئیں۔ خصوصیت سے ان مناظروں میں جس شخص نے ہمفانڈر کا مقابلہ کیا وہ مذہبی عالم نہیں بلکہ ڈاکٹر تھا۔ ان کا نام وزیر خاں تھا جنہوں نے ڈاکٹری کی تعلیم انگریزی کالج میں پڑھی تھی' انہوں نے عیسائیت کے بارے میں ان تمام کتابوں کا مطالعہ کیا کہ جو یورپ میں چھپی تھیں اور خاص طور سے یورپ کے سیکولر ادب اور ان کی مذہبی تحقیق سے پورا پورا فائدہ اٹھایا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمفانڈر ان کا مقابلہ نہیں کر سکا۔

انیسویں صدی میں ان مناظروں کی وجہ سے مذہبی امور میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور یہی وہ پس منظر تھا کہ جس میں یہ کوشش ہوئی کہ اسلام کو جدید اقدار کے مطابق ڈھالا جائے تاکہ وہ ابھرتے ہوئے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن جیسے جیسے مسلمان سیاسی طور پر کمزور ہوتے گئے اسی طرح سے وہ دوبارہ سے قدامت پرستی میں پناہ لینے لگے اور آج

ہمارے علماء پھر اسی حال پر پہنچ گئے ہیں کہ جہاں اکبر کے زمانہ کے علماء تھے۔

دراصل مغرب اور مشرق کے درمیان مقابلہ میں علم کا سوال سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جیسے جیسے ان کے اور ہمارے درمیان علم کا فاصلہ بڑھ رہا ہے' اسی طرح سے ہم پس ماندہ بھی ہو رہے ہیں اور احساس کمتری کا شکار بھی۔ اس لئے جب تک ہم اپنی علمی سطح کو بلند نہیں کریں گے اس وقت تک اپنی ذات و معاشرہ کا دفاع بھی نہیں کر سکیں گے۔

جنت کی تاریخ

تاریخ کے ہر دور میں انسان کے ذہن میں یہ خواہشات رہی ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ ہو کہ جہاں مساوات ہو' خوشی و مسرت و سکون ہو' کھانے کی وافر مقدار ہو' ابدی جوانی ہو اور انسان بوڑھاپے و بیماریوں سے محفوظ رہے۔ جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کے بجائے امن و امان ہو' دلوں میں نہ نفرت ہو' نہ حسد' اور نہ دشمنی۔ اور اس کے اردگرد کا ماحول ایسا ہو کہ جس میں ہرے بھرے درخت ہوں' پرندوں کی چہچہاہٹ ہو' صاف و شفاف پانی کی نہریں و چشمے ہوں۔

انسان کی یہ خواہشات اس ردعمل میں رہیں ہیں کہ جن سے وہ ہر دور میں دوچار ہوتا رہا ہے۔ اسے اپنی بقا کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی پڑی ہے' زندگی میں غیریقینی کی کیفیات سے دوچار رہا ہے۔ باہمی مقابلہ میں دشمنی و حسد و رقابت سے مار کھاتا رہا ہے۔ قحط' خشک سالی کی وجہ سے فاقہ زدہ رہا ہے۔ اور سنگلاج پہاڑوں و بیابانوں اور ریگستانوں میں پانی کی نعمت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے قدرتاً یہ اس کے خواب رہے ہیں کہ اسے ایک ایسا ماحول مل جائے کہ جہاں دنیاوی تکالیف نہ ہوں' بلکہ صرف آرام و آسائش ہو۔

انسان کی خواہشات کے اس پس منظر میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ شاید انسانی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ اور عہد رہا ہو کہ جب انسان کو ہر طرح کا سکون و اطمینان ہو۔ یہ عہد انسانی تاریخ کا "سنہری دور" رہا ہو' اور اس کی یادیں. انسان کی اجتماعی یادداشت میں محفوظ رہ گئیں ہوں' اور وہ ہر زمانہ میں اس سنہری دور کے حصول کے لئے خواہش مند رہا ہو۔ یہ جنت گم شدہ اس کے ارمانوں کا مرکز رہی ہے اور اسی کی خواہش میں وہ آج بھی سرگرداں ہے۔ اس جنت کے حصول کے لئے وہ ظلم و استحصال کے خلاف لڑتا ہے' ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے' طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے' اپنی ایجادات کے ذریعہ انسانی جسم کو سہولتیں پہنچاتا ہے' بیماریوں کے خلاف دوائیں بناتا ہے اور ان کا

علاج کرتا ہے' موت سے محفوظ رہنے کے لئے نت نئے طریقے استعمال کرتا ہے۔ اپنی جوانی کے عرصہ کو طویل کرنے کے لئے ورزشیں' اور وٹامنز کا سہارا لیتا ہے۔

اس لئے یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا انسان اپنے مسائل پر قابو پا کر اپنی گم شدہ جنت کو دوبارہ سے پا لے گا۔ فرق یہ ہے کہ انسان اس جنت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ رہا ہے' اور اس کا ہر نیا قدم اسے ایک کامیابی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ جنت ارضی کے قیام کی کوشش ہے۔ دوسری طرف مذہبی عقیدہ ہے کہ آسمانی جنت کا وجود بھی ہے کہ جہاں انسان مرنے کے بعد اپنے گناہوں کا حساب کتاب دے کر اس میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنت کی بھی کوئی تاریخ ہو سکتی ہے؟ انسانی تاریخ میں جنت کے بارے میں قوموں کے کیا نظریات رہے ہیں؟ ان سب نظریات کو باہم ملا کر اگر دیکھا جائے تو یہ موضوع انتہائی دلچسپ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فرانسیسی خاتون مورخ ژرین دے لوے نے "جنت کی تاریخ" نامی ایک کتاب لکھی جس کا انگریزی ترجمہ نیو یارک سے 1995ء میں چھپا۔

مصنفہ نے خوبصورت اور دلچسپ انداز میں جنت کے بارے میں مواد جمع کیا ہے۔ جنت کے معنی قدیم پہلوی یا فارسی زبان میں باغ کے ہیں' وہ باغ کے جو دیواروں میں گھرا ہوا ہو۔ اس باغ میں پھل پھول ہو' بہتی نہریں ہوں' عورتیں و مرد باہم مل جل کر رہتے ہوں۔ سمیریوں میں جنت کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں انسان و جانور کوئی بھی آپس میں نہیں لڑتے ہیں اور نہ یہاں کوئی بیماری ہوتی ہے۔

یونانیوں' یہودیوں' اور عیسائیوں میں ایک مثالی معاشرے کے بارے میں تین تصورات تھے۔ یہ کہ کسی عہد میں سنہری زمانہ رہا ہے؟ ایسے جزیرے ہیں کہ جہاں خوشی و مسرت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور ایلے زین فیلڈ (Elysian Fields) کہ جہاں کوئی دنیاوی مسائل نہیں ہیں۔ مشہور رومی شاعر اور مصنف "ہے سوئڈ" (Hesoid) نے سنہری دور کے بارے میں لکھا ہے کہ

تمام اذیتوں اور غموں سے دور انسانی دیوتاؤں کی طرح رہتا تھا۔
بوڑھاپے کی لعنت ان پر کبھی نہیں آتی تھی اور وہ مضبوط بازوؤں

> اور صحت مند جسموں کے ساتھ تمام دکھوں سے بے پرواہ خوشی و مسرت کے ساتھ رہتے تھے۔ جب وہ مرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے نیند نے ان پر غلبہ پا لیا ہے۔ ان کے پاس تمام اچھی چیزیں تھیں۔ ہر قسم کے پھل اس سرزمین سے ان کے لئے موجود تھے۔ وہ آرام اور امن سے رہتے تھے۔ ان پر دیوتاؤں کی مہربانیاں تھیں۔

افلاطون نے بھی اپنی کتاب اسٹیٹ مین (Statement) اس عہد کا ذکر کیا ہے کہ جب قارون (Choronos) کی حکومت تھی:

> ان کے پاس درختوں سے وافر مقدار میں پھل تھے جو کہ بغیر کسی محنت کے درختوں سے انہیں مل جایا کرتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کسی زراعت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی وہ زیادہ تر کھلی ہوادار اور روشن جگہوں پر رہتے تھے۔ نہ تو انہیں کسی لباس کی ضرورت تھی اور نہ سونے کے لئے بستروں کی' کیونکہ آب و ہوا معتدل اور ان کے مزاج کے مطابق تھی۔ زمین پر نرم اور آرام دہ لباس ان کے لئے پر تکلف بستر کا کام دیتا تھا۔

سسلی کے رہنے والے ایک مصنف نے جس کا نام ڈیڈورس (Didorus) تھا ایسے جزیروں کے بارے میں لکھا ہے کہ جو جنت کی مانند تھے۔ جنت کے بارے میں جو یہ تین نظریے تھے ابتدائی عیسائی عالموں نے ان تینوں کو رد کر دیا۔ مگر دوسری صدی عیسوی میں ایک ارضی جنت کے بارے میں ان کے خیالات بدلنا شروع ہو گئے اور اس کے وجود پر میں یقین آنے لگا۔ ان عیسائی عالموں کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ بائبل سب سے قدیم کتاب ہے اس لئے قدیم لوگوں نے جنت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد یہی ہے۔ اس لئے ان کے ہاں جنت ارضی کے بارے میں جو خیالات ابھرے ان میں جنت ایک ایسی جگہ تھی کہ جہاں خوشبوئیں تھیں' صاف و شفاف پانی تھا قیمتی ہیرے و جواہرات تھے اور جو اپنی خوبصورتی و دلکشی میں بے مثال تھی۔

اس جنت سے بھی انسان کی ان خواہشات کا پتہ چلتا ہے کہ جو اس کے دل میں ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہتا کہ کسی بھی چیز کا زوال ہو یا کوئی بھی شے ختم ہو جائے' اس کی خواہش

ہے کہ درخت ہمیشہ سرسبز رہیں' پھل اور پھول ہمیشہ ملتے رہیں اور یہ کبھی بھی نہ گلیں و سڑیں اور نہ مرجھائیں۔ پانی' شہد اور دودھ وافر مقدار میں ہو۔ ہر طرف سبزہ ہو اور موسم معتدل ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ مضبوط ہوتا رہا کہ جنت ارضی کا وجود ہے اور وہ دور دراز کے کسی علاقہ میں خفیہ مقام پر عام لوگوں کی پہنچ سے دور ہے اور اگر کسی کو وہاں جانا ہو تو اس کے لئے خاص اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ اس جنت ارضی کو خدا نے آسمان پر اٹھا لیا ہے اور اب وہاں مرنے کے بعد ہی جایا جا سکتا ہے۔

لیکن قرون وسطی میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ باغ عدن یا جنت ارضی دنیا سے ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ دور ہو گئی ہے' لہذا اس کو تلاش کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس باغ سے آدم و حوا کو نکالنے کے بعد انسانوں کے لئے اس میں داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے اس جنت کی تلاش ہوئی اور یہ تحقیق شروع ہوئی کہ یہ جنت کہاں ہے؟

1165ء میں یورپ میں یہ نظریہ مقبول تھا کہ ایشیا میں پریسٹر جان (Prester John) کی ایک عیسائی سلطنت ہے اور یہ جنت ارضی اسی کی سلطنت میں ہے۔ مارکوپولو نے حسن بن صباح کی جنت کے بارے میں لکھا کہ جو ایران میں قلعہ الموت پر واقع تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خیال مقبول ہوا کہ جنت کسی جزیرے میں ہے۔ جزیرہ کا تصور جنت سے اس لئے وابستہ ہوا کہ جزیرہ پانی سے گھرا ہوا عام لوگوں کی پہنچ سے دور ہوتا ہے۔ محدود جگہ ہونے کی وجہ سے یہ اپنی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔ پانی میں گھرا ہونے اور زمین سے دور ہونے کی وجہ سے یہ آلودگی سے پاک ہوتا ہے۔ قرون وسطی میں جزیرے کے بارے میں پراسرار ہونے کا تصور تھا اس لئے اس سے منسوب باتیں لوگوں میں پھیل جاتی تھیں اور اس کے بارے میں جنت کا دعوی کرنا آسان تھا۔ اسی لئے ٹامس مور کی یوٹوپیا بھی ایک جزیرے میں تھی۔

اس یقین کے بعد کہ جنت ارضی گم ہو گئی ہے اور اس کی تلاش کرنی چاہئے' اس نے کچھ لوگوں میں سیاحت کے شوق کو پیدا کیا کہ جس کے نتیجہ میں جغرافیائی دریافتیں عمل میں آئیں۔ امریکہ کی دریافت کے بعد اس جنت کی تلاش ہوئی کہ جہاں سونے و چاندی و ہیرے و جواہرات تھے۔ چونکہ امریکہ کے علاقے اس وقت تک اپنی فطری شکل میں تھے اس لئے وہاں جانے والے اس فطری خوبصورتی اور دلکشی کو دیکھ کر ششدر رہ گئے اور

انہوں نے ان علاقوں اور جنت میں مشابہتیں پائیں۔ کچھ کو برازیل میں جنت نظر آئی تو کچھ کو کیپ ہرموسو (Cape Hermoso) امیریگو ویسپوچی (Amerigo Vespucci) نے ایک خط میں جنوبی امریکہ کے بارے میں لکھا کہ :

> یہ دوستانہ ماحول کی سرزمین ہے۔ یہاں لاتعداد درخت ہیں کہ جو سرسبز پتوں سے ڈھکے رہتے ہیں جن سے انتہائی دل لبھانے اور مسحور کرنے والی خوشبو آتی ہے۔ ان کے پھل لذیذ اور جسم کو صحت مند بنانے والے ہیں۔ ساری زمین گھاس سے ڈھکی ہوئی ہے کہ جس پر پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے فضا معطر رہتی ہے۔ پرندوں کے غول کے غول ادھر ادھر اڑتے ہیں کہ جن کے رنگ، خوبصورتی، اور چہچہاہٹ کی دل ربائی بیان سے باہر ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ میں ارضی جنت میں پہنچ گیا ہوں۔

اسی زمانہ میں عیسائی عالموں نے دنیا کے جو نقشے بنائے اس میں جنت ارضی کی بھی نشان دہی کی۔ اس سلسلہ میں اختلافات ضرور رہے، مثلاً کچھ کا خیال تھا کہ یہ جنت ایتھوپیا میں ہے، کچھ اسے آرمینیا، عراق، فلسطین اور کچھ جنوبی امریکہ میں بتاتے تھے۔ کچھ ایسے عالم بھی تھے کہ جو اس بات کو مانتے تھے کہ ارضی جنت تھی، مگر پھر ایک بڑا سیلاب آیا اور اس میں یہ جنت غائب ہو گئی۔

بہرحال جنت کے اس تصور، اور اس گم شدہ جنت کی تلاش میں یہ ضرور ہوا کہ اگر یہ جنت نہیں ملتی ہے تو کیوں نہ اسی قسم کی جنت کی تشکیل کی جائے کہ جس کی منظر کشی کی جاتی رہی ہے۔ ایک ایسی جنت کے جو دیواروں میں گھری ہو، جہاں درخت ہوں، پرندے ہوں، آلودگی سے پاک ہو، اور بہتے ہوئے پانی کی نہریں ہوں۔ اس تصور کو عملی شکل دینے کے جذبہ نے یورپ میں باغوں کو مقبول بنایا۔ اور ایسے باغات بنائے گئے کہ جو اپنی خوبصورتی اور دلکشی میں جنت سے مشابہہ ہوں ان باغوں میں دوسرے ملکوں سے لا کر نئے درخت اور پھولوں کے پودے لگائے گئے۔ جگہ جگہ فواروں کے ذریعہ منظر کو خوبصورت بنایا گیا : اس مقصد کے لئے یورپ میں بوٹانیکل باغات کی ابتدا ہوئی اور 1533ء میں وینس میں،

1545ء میں پاڈوا میں' 1546ء میں پیسا میں' 1576ء میں پیرس میں' یہ باغات لگائے گئے۔ اس کے بعد سے باغات کو خوبصورت بنانے۔ اور ان میں قسم قسم کے درخت لگانے کی ابتداء ہوئی کہ جس کی وجہ سے یورپ کے شہر خوبصورت ہوتے چلے گئے۔

عیسائی عالموں نے اس پر بھی سیر حاصل بحث کی کہ ارضی جنت کو خدا نے کب بنایا؟ آدم کو کب تخلیق کیا؟ اور پھر اسے کس وقت جنت سے نکالا؟ ان سوالوں کے جوابات بڑے دلچسپ تھے۔ کچھ نے ان واقعات کی تفصیل سنہ وار دی ہے۔ ان میں خصوصیت سے ایک عیسائی عالم انو یجز (Inveges) ان سوالوں کا جواب اس طرح سے دیتا ہے۔

جمعہ' 25 مارچ۔ تخلیق کائنات کے چھ دن بعد

صبح کو حضرت آدم کو سرزمین عدن میں تخلیق کیا گیا۔

9 بجے کے قریب ان کو جنت ارضی میں لایا گیا۔

9 بجے سے 11 بجے تک حضرت آدم نے جنت میں چہل قدمی کی۔ انہیں خدا نے حکم دیا کہ اس باغ کا خیال رکھنا اور اسے ایسا ہی برقرار رکھنا۔

11 بجے کے قریب جب حضرت آدم باغ کے درمیان میں پہنچے تو انہیں دو احکامات ملے: تم تمام پھل کھا سکتے ہو' مگر خبردار اس درخت سے دور رہنا کہ جہاں نیکی و بدی کا علم ہے۔

12 بجے سے 3 بجے تک جانوروں کو حضرت آدم کے پاس لایا گیا جن کے انہوں نے نام رکھے۔

3 سے 4 بجے تک حضرت آدم سوتے رہے۔ اسی حالت میں حوا کی تخلیق ہوئی۔

4 بجے کے قریب آدم و حوا کی شادی ہوئی' اور ایک ہفتہ خوشی کا گذرا۔

جمعہ۔ یکم اپریل۔

دس بجے شیطان نے حوا کو بہکانا شروع کر دیا۔

11 بجے کے قریب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

دوپہر کے قریب حضرت آدم سے گناہ سرزد ہوا۔

3 بجے کے قریب دونوں گناہ گاروں کو فیصلہ سنایا گیا اور انہیں سزا دی گئی۔

4 بجے انہیں جنت ارضی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد سے باغ کو بند کر دیا گیا اور

اس کے دروازے پر ایک فرشتہ کو پہرہ پر بٹھا دیا گیا۔

عیسائی عالموں نے اس نکتہ پر بھی بحث کی کہ حضرت آدم و حوا کا قد کتنا لمبا تھا؟ تخلیق کے وقت ان کی عمر کتنی تھی؟ اور یہ کہ کیا وہ جنت ارضی میں تمام بیماریوں سے مبرا تھے؟ کیا وہ جنت میں کام کرتے تھے یا اپنا وقت بیکاری میں گذارتے تھے! جنت میں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا گیا کہ وہ یہاں درختوں کی حفاظت کرتے تھے۔ پودوں کو ترتیب سے رکھتے تھے۔ یہاں تمام جانور اور پرندے ان کے مطیع تھے۔ مشہور ریفارمر مارٹن لوتھر کا کہنا تھا کہ اگر آدم و حوا گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے تو نسل انسانی کو ان دنیاوی عذابوں اور اذیتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ نہ کاغذات کی ضرورت ہوتی' نہ کتابوں کی' کیونکہ اس صورت میں انسان کے پاس نہ ختم ہونے والی دانشمندی ہوتی۔

جب یہ سوال آیا کہ جنت کی زبان کون سی تھی' تو کچھ نے کہا کہ چونکہ عبرانی زبان سب سے پرانی ہے' اس لئے خدا نے آدم سے اسی میں گفتگو کی تھی۔ مگر اس نے قوم پرستوں کو چیلنج کیا اور مختلف فرقوں کے عالموں نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ جنت کی زبانیں فلمش' سویڈش اور ڈینش تھیں۔

یہ سوال بھی آیا کہ کیا جنت میں مرد اور عورت مساوی تھے؟ اس کا جواب دیا گیا کہ اگر یہ گناہ نہیں کرتے تو یہ دونوں برابر کا درجہ رکھتے۔ اور اگر حوا شیطان کے بہکانے میں نہیں آتیں تو ان کا درجہ نیچے نہیں گرتا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ فطرتاً حوا کو اطاعت گذار ہونا چاہئے تھا۔

کیا جنت میں نجی جائداد ہوتی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سینٹ امبروز کا کہنا تھا کہ جنت میں نجی جائداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سترھویں صدی میں اس جواب میں ترمیم کر کے اسے یوں کہا گیا کہ اگر جنت میں کوئی درختوں سے پھل جمع کرتا تو یہ اس کی ملکیت ہوتے اور انہیں چھیننا ناانصافی ہوتا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت یورپ میں نجی جائداد اور اس کے تقدس کے بارے میں خیالات مستحکم ہو رہے تھے۔

جنت ارضی کے بارے میں اس وقت اعتراضات شروع ہوئے کہ جب سترھویں صدی سے یورپ کے مفکرین اور عالموں نے بائبل کے باب اول تخلیق کائنات پر اعتراضات شروع کئے اور نتیجتاً ابتدائی گناہ اور جنت ارضی کے بارے میں کہا جانے لگا کہ یہ سب

غلط ہے اور دلیل سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ سائنسدانوں کی نئی تحقیق نے ارتقاء کے نظریہ کی ابتداء کہ انسان نے دور وحشت و بربریت سے ارتقائی طور پر ترقی کی۔ چنانچہ اس کے بعد سے تخلیق و ارتقاء کے درمیان جو تصادم ہوا' اس میں سائنس نے ارتقاء کے نظریہ کی حمایت کی اور یہ ثابت کیا کہ انسان مکمل طور پر پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ اس کی ارتقائی شکل ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے ارتقاء کا نظریہ مضبوط ہوتا چلا گیا اس طرح سے تخلیق کا نظریہ کمزور ہوا' اور اسی کے ساتھ جنت ارضی کے بارے میں بھی لوگوں کے خیالات بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ دنیا کی دریافت کے بعد یہ تمام امکانات ختم ہو گئے کہ یہ جنت انسان کی نظروں سے دور کسی جگہ روپوش ہے۔ اس کے بعد سے ارضی جنت نے آسمانی بہشت کی شکل اختیار کر لی' کیا انسان اس آسمانی بہشت کا بھی سراغ لگائے گا اور اسے ایک دن دریافت کر لے گا؟

جہنم کی تاریخی تشکیل

ابتداء ہی سے انسان کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات پر غورو فکر کرتا رہتا ہے اور اس سے نتائج نکالتا رہتا ہے۔ اسی عمل کے نتیجہ میں نئے خیالات و افکار پیدا ہوئے' اور انسان نے خود اپنے آپ کو سمجھا' ان افکار کی بنیاد پر نئے نئے سماجی و سیاسی اور معاشی اقدار' روایات اور ادارے بنائے۔ ان ہی میں سے ایک دوزخ' یا جہنم کا تصور ہے کہ جو انسانی تہذیب و تمدن' اور افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نئی نئی شکلوں میں ابھرا۔ جب انسانی سماج کی تشکیل ہوئی' اور ساتھ ہی میں انسانی مفادات کا ٹکراؤ ہوا تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں ترتیب و تنظیم' اور ہم آہنگی قائم کرنے کی غرض سے نیکی بدی جرم و سزا' انصاف و ناانصافی کی روایات بھی پیدا ہوئیں۔ اس مرحلہ پر یہ دیکھا گیا کہ کچھ لوگ تو ہیں کہ جنہیں ان کے جرائم کی سزا ملتی ہے' مگر کچھ وہ لوگ ہیں جو اس سزا سے مبرا رہتے ہوئے کامیاب زندگی گذارتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لوگ کہ جو صاحب اقتدار ہوتے ہیں' وہ اپنے اقتدار کے نشہ میں جو چاہیں کریں' کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی تھی کہ جو ان کے جرائم کی سزا دے۔ اس لئے یہ تصور ابھرا کہ اگر گناہ گاروں اور مجرموں کو اس دنیا میں سزا نہیں ملتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سزا سے بچ جائیں گے' یہ سزا انہیں دوسری دنیا میں ملے گی۔ اس تصور نے کمزور اور مظلوم لوگوں کو تسکین کا ایک احساس دیا کہ اگر ان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ظالموں کو سزا دے سکیں' تو یہ سزا انہیں آخرت میں ضرور ملے گی۔

تاریخ میں دوزخ' یا جہنم کا تصور کیسے پیدا ہوا' اور کن کن مرحلوں سے گذرا' اس موضوع پر ایلین۔ ای۔ برن اشٹائن نے "دوزخ کی تشکیل" نامی کتاب میں بیان کی ہے کہ جو 1993ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے بڑی تحقیق کے بعد موت کے سلسلہ میں مختلف نظریات جو دنیا کے مذاہب میں رہے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ کہ جزا و سزا

کا تصور بھی بعد کی پیداوار ہے' مثلاً میسوپوٹامیہ میں یہ خیال یہ تھا کہ مرنے کے بعد مردے بغیر کسی جزا و سزا کے عمل سے گذر کر رہیں گے۔

انسان کے لئے موت کو اس طرح سے قبول کرنا کہ یہ زندگی کا خاتمہ ہے' قابل قبول نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موت ایک وقتی لمحہ ہے کہ جس کے گذرنے کے بعد انسان کو دوبارہ سے زندگی ملے گی اور زندگی کا تسلسل جاری رہے گا اس لئے اکثر تہذیبوں میں مردے کے ساتھ اس کے استعمال کی اشیاء رکھ دی جاتی تھیں اور خیال یہ تھا کہ مردوں کی اپنی علیحدہ دنیا ہوتی ہے' جو زندوں کی دنیا سے دور ہے۔ دجلہ و فرات کی وادی میں مردوں کی سرزمین کو بہت دور سمجھا جاتا تھا جب کہ مصری تہذیب میں یہ خیال تھا کہ مردوں کی دنیا زمین کے نیچے آباد ہے۔

اس لئے اکثر قدیمی داستانوں میں یہ تذکرے ملتے ہیں کہ مردوں کی اس دنیا کی تلاش کے لئے کئی لوگوں نے سفر کئے اور ان دونوں دنیاؤں میں رابطے کی کوششیں کیں۔ مثلاً گل گامیش کی کہانی میں ہے کہ وہ اپنے دوست ان کیڈو کی وفات کے بعد کہتا ہے کہ "میں کس منہ سے زندہ ہوں' جب کہ میرا دوست مٹی ہو گیا ہے۔ کیا میں بھی ایک دن اسی طرح سے لیٹ جاؤں گا اور پھر کبھی بھی نہیں اٹھ سکوں گا؟" اس لئے وہ زندگی اور موت کے اس راز کو جاننے کے لئے مردوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات اتناپسنم سے ہوتی ہے کہ جسے دیوتاؤں نے ابدی زندگی دیدی ہے۔ وہ گل گامیش سے کہتا ہے کہ اگر وہ سات دن اور سات راتیں جاگ کر گزار دے تو دیوتا اسے بھی ابدی زندگی دے سکتے ہیں۔ مگر گل گامیش نیند پر قابو نہیں پا سکا' اس پر وہ کہتا ہے کہ "وہ ہیرو کہ جو ابدی زندگی چاہتا ہے۔ نیند سے مقابلہ نہیں کر سکا۔" اس کے بعد داستان اور آگے بڑھتی ہے کہ وہ سمندر سے ایک پودہ نکالتا ہے کہ جس کے کھانے سے اسے ابدی جوانی مل سکتی تھی مگر وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا اور نہانے چلا گیا۔ اس دوران میں ایک سانپ اسے دوبارہ سے سمندر میں لے گیا۔ اس ناکامی کے بعد گل گامیش ابدی زندگی کے خیال کو ترک کر کے موت کو قبول کر لیتا ہے۔ انسان موت کو تو قبول کر لیتا ہے' مگر وہ موت کے بعد کی زندگی کی تلاش میں پھر بھی سرگرداں رہتا ہے۔ اور اس تلاش میں وہ "مردوں کی دنیا" کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جہاں مردے' زندوں سے علیحدہ اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔

اس خیال کو سب سے زیادہ واضح انداز میں اہل بابل نے پیش کیا۔ ان کے ہاں مردوں کی دنیا زمین کے نیچے آباد تھی کہ جہاں سزا اور جزا کے بغیر وہ سب مل کر رہتے تھے۔ ان کی دنیا میں زندوں کی طرح بادشاہ' اس کے امراء اس کے محلات تھے۔ یہاں پر کسی کو اذیت نہیں دی جاتی تھی' بلکہ بطور سزا صرف قید کر دیا جاتا تھا۔ مردوں نے اپنی دنیا کے دفاع کے لئے قلعے' فصیلیں' دروازے اور دوسری رکاوٹیں بنا رکھیں تھیں۔ اس دنیا میں کسی زندہ شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی' اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تو اسے سزا ملتی تھی۔ اہل بابل ان دو دنیاؤں میں توازن برقرار رکھتے تھے اور انہیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رکھتے تھے۔

مصریوں میں مردوں کی دنیا میں جزا اور سزا کا تصور ہے۔ اہرام مصر میں جو تصاویر ملی ہیں' ان میں فرشتوں کو ترازو لئے دکھایا گیا ہے کہ جو نیکی و بدی کا وزن کرتے ہیں۔ اس وقت انسان کا دل اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ مردوں کی یہ دنیا دریا کے پار ہے کہ جس میں مردے کشتی میں بیٹھ کر وہاں جاتے ہیں۔ مصریوں میں اس دنیا کے بارے میں جو تذکرے ملے ہیں' ان میں یہ ہے کہ مردہ شخص ایک ہال سے گذر کر کمرے میں داخل ہوتا ہے کہ جہاں اس کی نیکیوں اور گناہوں کو تولا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو سزا ملتی ہے وہ آگ کی نہر میں ڈالے جاتے ہیں' یا انہیں ایک بڑے اژدھے کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ جو ان پر آگ پھینکتا ہے۔ سزا کے طور پر جسم کے ٹکڑے کرنے' اور گناہ گاروں کو گڑھوں میں الٹا لٹکانا بھی پایا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کے دشمنوں کے بارے میں جو ان پر ایمان نہیں لائے ہیں' کہا جاتا ہے کہ

> "آگ تمہارے خلاف ہے۔ شعلے تمہارے خلاف ہیں۔ تپتی آگ تمہارے خلاف ہے۔ یہ تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی' یہ تمہیں اس طرح سے کاٹے گی کہ تم ان کو کبھی نہیں دیکھ سکو گے کہ جو زمین پر زندہ ہیں۔"

ان سزاؤں کے ساتھ ساتھ مصری اس پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ اگر کچھ دعائیں پڑھی جائیں' اور تصویروں کا استعمال کیا جائے تو وہ ان سزاؤں سے بچ سکتے ہیں۔

انسان نے موت کے بعد بھی زندگی کے تسلسل کو اس وقت ایک نیا نظریہ دیا کہ جب

یہ کہا گیا کہ جسم اور روح دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ موت کے بعد جسم تو فنا ہو جاتا ہے' مگر روح زندہ رہتی ہے' یونانیوں میں موت کے بارے میں بھی دو خیالات تھے۔ ان کے نزدیک لوگوں کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جو مرنے کے بعد بغیر کسی سزا و جزا کے رہیں گے۔ دوسرے وہ عظیم لوگ ہیں کہ جنہوں نے دیوتاؤں سے بغاوت کی ہے۔ ان لوگوں کو بغاوت کے جرم میں ابدی اذیت دی جائے گی۔ مدت کے بعد ان دو تصورات سے یونان کے سماج کے بارے میں جو ذکر ملتا ہے' اس میں مردے زیر زمین رہتے ہیں۔ انہیں گناہوں کی کوئی سزا نہیں ملتی ہے۔ صرف ایک اذیت جس سے وہ دوچار ہوتے ہیں وہ ان کی دنیاوی یادداشتیں ہوتی ہیں' یا وہ شرم کے جن حالات میں ان کی موت واقع ہوئی۔ اگر کسی مردہ کی شاندار طریقے سے تجہیز و تکفین نہیں ہوئی ہو تو مردوں کی دنیا میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی ہے۔

سقراط نے موت کے بارے میں کہا کہ اس کے بعد انسان کے فانی و غیر فانی حصے علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں چونکہ روح جسم کے بعد باقی رہتی ہے۔ اس لئے اسے اگلی دنیا میں جزا و سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سقراط کا کہنا تھا کہ اگر موت کے بعد انسان ہر چیز سے آزاد ہو جائے تو اس سے بدمعاش اور ظالم شخص کو فائدہ ہو گا کیونکہ مرنے کے بعد نہ صرف وہ اپنے جسم سے آزاد ہو جائے گا بلکہ اپنے گناہوں سے بھی۔ اس لئے موت کے بعد سزا کا ہونا لازمی ہے۔

یونانیوں میں مردوں کی یہ زیر زمین دنیا ہاڈیس (Hades) کہلاتی ہے۔ اس میں جب روح داخل ہوتی ہے تو اسے انصاف کے لئے لے جایا جاتا ہے۔ سزا کے بعد روحوں کو مختلف درجوں میں رکھا جاتا ہے۔ مثلاً وہ روحیں جو پاک ہوتی ہیں انہیں اول درجہ میں اور جو ناقابل معافی ہوتی ہیں انہیں سب سے آخری درجہ میں ابدی سزا کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رومی عہد کے ایک مورخ پلوٹارک نے اس سوال کو اٹھایا ہے کہ آخر گناہ گاروں کے لئے خدا کے عذاب میں دیر کیوں ہے؟ انہیں اس دنیا میں سزا کیوں نہیں ملتی ہے؟ جب سزا میں دیر ہوتی ہے تو اس سے شک پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے خدا کو اسی دنیا میں سزا دینی چاہئے تاکہ سب کو نظر آئے۔

رومی بھی اس پر یقین رکھتے تھے کہ مردہ لوگوں کی علیحدہ دنیا ہے۔ اور ان کا زندہ لوگوں سے رابطہ روحوں' اور بھوتوں کے ذریعہ رہتا ہے۔ یہ زندہ لوگوں کے خواب میں آتے ہیں۔

یہودیوں نے موت کے بعد سزا و جزا کے تصور کو قائم کیا۔ ان کے نزدیک نہ صرف گناہ گاروں کو سزا ملے گی بلکہ ان اقوام کو بھی کہ جو یہودیوں کی دشمن ہیں۔ ان کے ہاں سب سے پہلے "جی ہنا" کا تلفظ استعمال کیا گیا جو بعد میں عربی میں جہنم ہو گیا۔ یہودیت و عیسائیت اور اسلام میں موت کے بعد قیامت کے دن سب مردے اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور اس وقت ان کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی اور اسی حساب سے انہیں سزا دی جائے گی۔ اس سوال پر کئی رائیں ہیں کہ کیا سزا وقتی ہو گی۔ یا ابدی' یا گناہ گاروں کو اپنے گناہوں کی سزا کے بعد معافی مل جائے گی۔

جنت اور جہنم کے نظریات کے بارے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں : کیا یہ ان کمزور لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں کہ جو ظالموں اور طاقت وروں سے مقابلہ نہ کر سکے اور آخر میں اس کا حل یہ نکالا کہ ان کے صبر اور جبر کو برداشت کرنے کے سلسلہ میں انہیں جنت ملے گی اور ظالموں کو جہنم؟ اور کیا یہ ان صاحب اقتدار لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے کہ جو استحصال سے پاک معاشرہ قائم نہیں کر سکے اور لوگوں کے انتقام اور غصہ کو دبانے کے لئے یہ کہا کہ اگر کسی نے بغاوت کی' چوری کی' اور معاشرہ کے نظم و ضبط کو خراب کرنے کی کوشش کی تو انہیں ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا اور جو لوگ تابع دار اور اطاعت گزار رہے اور خاموشی سے ہر چیز کو برداشت کیا انہیں بطور انعام جنت میں اچھا مقام ملے گا؟

عیسائی مذہب میں جہنم کا تصور آگ سے ہے۔ ایک ایسی آگ کہ جو جسموں کو جلا کر بھسم کر دے گی' اور یہ عمل بار بار دہرایا جائے گا۔ اس تصور کے پس منظر میں انسان کے سامنے آگ کی وہ تباہی تھی کہ جو آناً" فاناً" جنگلوں اور آبادیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی تھی اور زندگی کے تمام نام و نشان کو مٹا دیتی تھی۔ اس کے علاوہ آگ سے جلنے کی اذیت کو برداشت کرنا اور اس عمل سے گذرنا صبر آزما مرحلہ تھا۔ اس لئے جہنم میں اذیت کا ایک طریقہ کار آگ میں جلنا ہے۔ اگرچہ بائبل میں جہنم اور آگ کے بارے میں چند بار ذکر آیا

ہے۔ لیکن ان میں آگ کے ذریعہ جو سزا دی جائے گی اس کا ذکر ہولناک انداز میں کیا گیا ہے۔ بائبل میں برزخ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بارہویں صدی میں مبلغیں نے بیان کیا اور اس خیال کو لوگوں نے مقبولیت کے ساتھ قبول کیا۔

جوہان گوڈس بلوم نے اپنی کتاب "آگ اور تہذیب" (پنگوئن 1994ء) میں جہنم اور آگ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابتداء میں شمالی یورپ کے لئے یہ تصور کہ جہنم میں آگ ہو گی کوئی زیادہ ڈرانے والا تصور نہیں تھا' کیونکہ ان کے لئے ٹھنڈک زیادہ اذیت ناک تھی۔ اس لئے آگ اور جہنم کا تعلق ان علاقوں سے ہے کہ جو گرم تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ عیسائی یورپ میں آگ اور جہنم دونوں نے قبولیت حاصل کر لی اور جب یورپ میں قرون وسطی میں جادوگرنیوں اور مشرکوں کو سزا دی گئی تو انہیں آگ میں زندہ جلایا گیا تاکہ اس کے ذریعہ انہیں جہنم کی سزا ملے اور لوگ اس آگ کو دیکھ کر اس اذیت کو محسوس کریں کہ جو گناہ گاروں کو دی جائے گی۔

خانہ بدوش

قدیم تاریخ کی تشکیل ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے تمام ماخذ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس لئے اس میں مفروضے قائم کئے جاتے ہیں۔ اور پھر ان مفروضوں پر کوئی رائے دی جاتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اس رائے کے لئے اگر کوئی شہادت مل جائے تو اس سے مدد لی جائے۔ اس لئے قدیم تاریخ مورخوں کی تخیل آرائی کا ایک وسیع میدان ہے۔
لیکن تاریخ کی تشکیل محض ماضی کے چھوڑے ہوئے آثاروں' کتابوں' شہادتوں' سکوں اور عمارتوں سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ماخذ زندہ اور متحرک لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ قومیں' قبیلے' اور برادریاں اچانک پیدا نہیں ہوتیں بلکہ یہ ایک سلسلہ کی کڑی ہوتی ہیں۔ تاریخ کا ایک تسلسل کہ جو اپنے اندر تاریخی واقعات اور اس کی حقیقتیں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ اگر تاریخ کی تشکیل ان زندہ لوگوں کو پڑھ کر کی جائے تو یہ تاریخ زندگی کی حرارت اور گرمی لئے ہوئے ہو گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یا معاشروں کو کیسے پڑھا جائے؟ انہیں دور سے دیکھ کر ان کے بارے میں پڑھ کر اور سن کر محض سطحی رائے قائم ہو گی۔ اس لئے لوگوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں رہا جائے اور ان جیسا بنا جائے۔ اس وقت ان کے سینوں میں جو ماضی کے خزانے دفن ہیں۔ وہ برآمد ہونا شروع ہوں گے۔ ان کے گیتوں' کہانیوں' قصوں ان کے رقص رسم و رواج' لباس عادات و اطوار اور حرکات سے چھپی ہوئی تاریخ ظاہر ہونے لگے گی۔ اب یہ مورخ اور لکھنے والے کا کام ہے کہ اس چھپی تاریخ کو ظاہر کرے' اور پھر بکھرے ہوئے واقعات کو سمیٹ کر ان کو کوئی شکل دے۔

تاریخ میں خانہ بدوشوں کی زندگی بھی اس قسم کی ہے۔ یہ تاریخ کے گمنام' بھلائے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں۔ یا یوں کہئے کہ یہ تاریخ کے نہ نظر آنے والے لوگ ہیں۔ تاریخ بنتی و بگڑتی رہتی ہے۔ انقلابات آتے رہتے ہیں۔ قوموں اور تہذیبوں کے عروج

و زوال ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ خانہ بدوش قبائل اس سے بے پرواہ اور تاریخ سے دور اپنے وجود کو مضبوطی سے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو ٹھکرا دیا ہے یہ تاریخ کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں تاریخی عمل سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اس میں جنگ و جدل' سفارش و دھوکہ دہی اور دولت و جائیداد کے حصول کے سوا کچھ نہیں۔ یہ خانہ بدوش قبائل تاریخ کے اس عمل سے بالاتر ہیں۔ نہ اُنَ کی زمین ہے' نہ جائیداد' اور نہ گھر۔ اس لئے نہ انہیں جنگ کی ضرورت ہے۔ نہ سازش کی۔ اور نہ دولت کی۔

خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے ان کا تعلق فطرت سے ہوتا ہے' یہ فطرت سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ اس کی خاطر وہ شہری تہذیب و تمدن کو دھتکار دیتے ہیں۔ شہری ہنگامہ خیز زندگی میں ان کے لئے کوئی جاذبیت اور دلکشی نہیں۔ وہ زراعت اور کاشتکاری بھی نہیں کرتے یہ کہ انہیں جکڑ کر ایک جگہ نہ بٹھا دے' یہ متحرک زندگی کے شیدائی ہیں کہ جس میں کوئی ٹھہراؤ اور جمود نہیں۔ اس لئے وقت بدلتا رہا' انسان صنعتی دور میں داخل ہوا' اور کسان کھیت چھوڑ کر مزدور بن گئے۔ مگر خانہ بدوش اسی طرح سے آزاد رہا' اس نے کسی بھی قیمت پر کسی جگہ رک کر اپنی آزادی کا سودا نہیں کیا۔ اس نے اگر کوئی پیشے بھی اختیار کئے تو وہ اس کے آزاد پیشے تھے۔ ہاتھوں کی ہنرمندی' اور ذہنی تخلیق سے اس نے فن کو کمال تک پہنچایا۔ یہ ایک حیرت ناک عمل ہے کہ اس نے نشیب و فراز' اور تبدیلیوں کے باوجود فطرت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔

یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ یہ خانہ بدوش کون ہیں؟ اور کیوں انہوں نے اس زندگی کو اختیار کیا؟ ان خانہ بدوشوں میں وہ لوگ شامل ہیں کہ جنہیں حملہ آوروں نے ان کے شہروں' گھروں' اور زمینوں سے بے دخل کر دیا۔ اور پھر یہ ایسے خانہ بدوش بنے کہ انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور آگے بڑھتے ہی چلے گئے تاکہ وہ اپنی شکست اور ذلت کو بھول جائیں۔

یا یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے انسانی تہذیب اور بدلتے ہوئے حالات کو قبول نہیں کیا اور خود کو اس طرح فطرت سے وابستہ رکھا جیسے کہ وہ شروع سے تھے۔ شہر بستے رہے اور آبادیاں آباد ہوتی رہیں مگر وہ اس طرح ان سے دور بھاگتے رہے۔ خانہ بدوش مسلسل

سفر کر کے اپنی شناخت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ٹھہر جاتے ہیں تو اس صورت میں آبادی کی روایات' ادارے' قانون کو اختیار کرنا ہو گا' اور اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی آزادی کو بھی قربان کرنا ہو گا۔ اور یہ شاید انہیں گوارا نہیں۔

ہندوستان میں خانہ بدوش قبائل کے بارے میں خیال یہ ہے کہ اس کی وجہ دراوڑ اور آریاؤں کا تصادم ہے کہ جس کی وجہ سے فاتح آریاؤں نے مفتوح دراوڑوں کو یا تو خانہ بدوش بنا دیا یا انہیں نچلی ذاتوں میں تبدیل کر دیا۔ مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیونکہ نہ تو آریہ قبائل ایک دم آئے اور نہ ہی یہ سارا عمل اچانک ہوا۔ اول تو آریہ کسی ایک نسل کا نام نہیں۔ بلکہ جو مختلف قبائل ہندوستان میں آئے ان سب کے لئے بعد میں اس کا اطلاق ہوا جو کہ نسلی نہیں ہے۔ دوسرے جب بھی کوئی حملہ آور آتا ہے یا کوئی قبیلہ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے آتا ہے تو جہاں مقامی و غیر مقامی باشندوں میں تصادم ہوتا ہے وہیں ان میں ملاپ کا بھی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اکثر فاتح اقوام اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ مفتوح لوگوں کے اعلیٰ طبقوں کا تعاون حاصل کریں۔ اور ان کی مدد سے لوگوں پر حکومت کریں۔ اکثر انہیں یہ تعاون آسانی سے مل جاتا ہے کیونکہ اعلیٰ طبقے اپنی مراعات اور حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آریہ قبائل اور دراوڑوں میں یہ تعاون اونچی سطح پر ہوا ہو گا۔ اور بعد میں جیسے جیسے ریاست کا ڈھانچہ بنتا گیا ہو گا۔ محنت کرنے والے لوگ نچلی سطح پر آتے گئے ہوں گے۔ ان میں آریہ اور دراوڑ دونوں شامل ہوں گے۔ اس کی مثال کرشن اور بہت سی دراوڑ عہد کی دیویوں کو مذہبی طور پر اونچا درجہ دینے کی ہے۔ اس لئے ہندو سماج میں جو ذات پات کی تقسیم ہوئی وہ ملی جلی تھی۔ اور اس کی بنیاد نسلی نہیں بلکہ معاشی اور سماجی تھی۔

ایک اہم بات جس کی طرف یحییٰ امجد نے تاریخ پاکستان = قدیم دور میں کہا ہے وہ یہ کہ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے ایسے شواہد ملتے ہیں کہ جس سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ ذات پات کی تقسیم آریاؤں کی آمد سے قبل دراوڑوں میں موجود تھی' اور یہ آریہ اپنے ساتھ نہیں لائے بلکہ انہیں یہاں سے سماج میں موجود ملی۔ کیونکہ اگر آریہ ذات پات کے ڈھانچے کے ساتھ آتے تو یہ ان تمام ملکوں میں ساتھ لے کر جاتے کہ جہاں وہ گئے تھے۔ یقیناً ذات پات کے اس ڈھانچہ میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں گی مگر "جیسا کہ

کوسمبی" نے کہا ہے کہ ذات پات کی تقسیم میں پیداواری رشتوں کا بڑا تعلق ہے۔ جن قبائل نے بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اور کاشتکاری کے عہد میں رہے وہ سماجی طور پر نیچے ہوتے چلے گئے۔

شاید خانہ بدوش قبائل کا تعلق بھی انہیں طبقات سے ہے کہ جو غذا جمع کرنے یا شکاری دور میں سے تھے اور جنہوں نے زراعتی معاشرہ کو قبول نہیں کیا۔ اور معاش کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہے۔

تاریخی عمل میں قومیں، جماعتیں، اور گروہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر کے جاتے رہے ہیں، مگر ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جہاں جائیں وہاں جا کر آباد ہو جائیں اور اپنی مستقل رہائش کا انتظام کریں۔ ہجرت ہمیشہ ناساعد حالات میں ہوتی ہے، اور مہاجروں کو نئے حالات سے مقابلہ کرنے اور کسی دوسرے معاشرے میں ضم ہونے کے لئے اپنی روایات و اقدار اور زبان تک کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی عمل سے قومیں ملتی رہتی ہیں، معاشرے بدلتے رہتے ہیں، اور ایک نئی ثقافت ابھرتی رہتی ہے۔

تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ جب کسی جماعت نے ہجرت تو کی، مگر خود کو کسی دوسرے معاشرے میں ضم نہیں ہونے دیا اور اپنی علیحدہ شناخت کو برقرار رکھا۔ تاریخ میں اس کی ایک مثال جپسیوں کی ہے کہ جنہوں نے خود کو کسی ایک معاشرے میں گھل مل جانے اور اپنی شناخت کھو دینے کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی کہ وہ مسلسل خانہ بدوشی کے عمل میں رہیں تاکہ یہ حرکت انہیں کسی ایک جگہ مستقل ٹھہرنے پر مجبور نہ کرے اور وہ دوسروں کی ثقافت میں مل نہ سکیں۔

خانہ بدوشی کی زندگی اس لئے ایک تکلیف دہ عمل ہے کیونکہ اس کی وجہ سے زمین سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، ایسی جماعت کی جڑیں کہیں نہیں ہوتیں، اس لئے وہ زمین سے محروم اور لاتعلق ہر جگہ اجنبی سمجھا جاتا ہے کہ جس کی وفاداری کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خانہ بدوشی کی وجہ سے معاشروں میں جو تبدیلیاں آتی ہیں، یہ اس سے دور رہتے ہیں۔ اور جب بھی کسی معاشرہ میں ضم نہیں ہوا جائے، تو علیحدہ رہنے والوں کے خلاف تعصبات کا پیدا ہونا فطری ہو جاتا ہے۔ دوری کی وجہ سے ان کے بارے میں عجیب عجیب روایات پیدا ہوتی ہیں، اور لوگ ان سے ملتے ہوئے کتراتے ہیں۔

خانہ بدوش لوگوں کی ایک روایت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی کوئی جائداد نہیں ہوتی ہے۔ خصوصیت سے روایتی معاشروں میں گھر' خاندان' جائداد اور کاروبار کا ہونا صاحب عزت لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ جو جماعت بھی ان روایات سے بغاوت کرتی ہے تو معاشرے سے علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس جماعت کے لئے معاشی طور پر بھی مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنا گذارہ کیسے کرے؟ خانہ بدوش لوگوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جائداد' ملازمت' اور مستقل رہائش ان کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں' اس لئے وہ ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں کہ جن کی ضرورت ہر جگہ ہو اور وہ اتنا کما سکیں کہ جو ان کے گذارے کے لئے کافی ہو۔

اس تناظر میں جپسیوں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک گروہ نے کس قدر مستقل مزاجی کے ساتھ کسی ایک جگہ آباد ہونے سے انکار کیا' دنیاوی آسائشوں کو ٹھکرایا' اور اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے تمام شخصیتوں کے باوجود' جگہ جگہ دربدر ہونے کو ترجیح دی۔

یہ ضرور ہے کہ جپسی تاریخ میں ہونے والی تبدیلی سے دور نہیں رہ سکے اور وہ اس سے متاثر ہوئے' مگر اس کے باوجود آج ان کی علیحدہ شناخت ہے' اور اسی لئے ماہر علم بشریات کو اس گروہ سے دلچسپی پیدا ہوئی کہ وہ کون سے محرکات تھے کہ جن کی وجہ سے انہوں نے خانہ بدوشی کو قبول کیا؟ اور کیوں اور دوسری جماعتوں کی طرح معاشروں میں گھل مل نہیں گئے؟

جپسیوں کی تاریخ اور ثقافت میں یوں تو اب تک لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں' مگر ایک نئی کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں پرانی اور جدید تحقیق کو شامل کر کے جپسیوں کے بارے میں مستند حوالوں سے لکھا گیا ہے یہ کتاب مشہور جپسی ماہر اگنس فریزر (Agnus Frasez) کی ہے جس کا نام "دی جپسیز" ہے۔ اس کی پہلی اشاعت 1992ء میں ہوئی تھی' اور اس کے دو ایڈیشن 1993ء اور 1994ء میں شائع ہوئے۔ اگنس فریزر نے جپسیوں کی ابتداء اور خاص طور سے یورپ میں وہ کن کن مراحل سے گذرے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس تحقیق سے جپسیوں کے بارے میں بہت سے نئے پہلو ابھرے ہیں جو دلچسپی کا باعث ہیں۔

محققین کی اکثریت اب اس بات پر متفق ہے کہ جپسیوں کا وطن ہندوستان کی سرزمین ہے اور یہ یہاں سے ہجرت کر کے یورپ گئے۔ رہا ان کی ذات کا سوال تو کچھ مورخین انہیں ڈوم ذات سے بتاتے ہیں کیونکہ موسیقی اور گانے میں ان کو جو مہارت ہے اس کا تعلق اسی ذات کے لوگوں سے ہے۔ مگر جپسی خود کو ڈوم جیسی نچلی ذات سے منسوب نہیں کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کا تعلق کشتریا' جاٹ اور راجپوت ذاتوں سے ہے۔ اس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ ذات پات کے سلسلہ میں خود جپسی بھی متعصب ہیں اور خانہ بدوشی کے باوجود وہ ذات پات کی ادنیٰ و اعلیٰ تفریق کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ حالانکہ جب ایک مرتبہ وہ ہندوستان کے ذات پات والے معاشرے سے باہر نکل گئے تو پھر ذات پات کی تفریق بھی اہم نہیں رہی۔ مگر یہ انسان کی اندرونی خواہش ہے کہ وہ خود کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر سمجھے' لہٰذا اعلیٰ ذات سے تعلق قائم رکھنا بھی اس کی علامت ہے۔

ہندوستان میں جپسیوں کا تعلق بنجاروں سے ملتا ہے جو کہ سولہویں صدی عیسوی میں ابھرے' ان کا پیشہ خاص طور سے اجناس کی تجارت تھا' جو یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سپلائی کرتے تھے۔ دوسرے پیشوں کے لحاظ سے یہ لوہار' سنار' تماشہ کرنے والے' اور قسمت کا حال بتانے والے تھے۔ ہندوستان و پاکستان میں اب تک کئی ایسے قبائل ہیں کہ جو خانہ بدوشی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور ایک جگہ مستقل رہائش اختیار نہیں کرتے ہیں۔ اب یہ اور پیشوں کی جگہ وقتی طور پر محنت و مزدوری بھی کر لیتے ہیں۔

انہوں نے ہندوستان کب اور کیوں چھوڑا؟ اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا ایک جماعت نے ہجرت کی' یا وقت کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے کر کے ہجرت کر گئے؟ ایک عام خیال یہ ہے کہ ان کے ابتدائی گروہوں نے چار صدی قبل مسیح میں ہندوستان چھوڑا' اور یہاں سے یہ ایران گئے۔

ان کے بارے میں ایک ایرانی مورخ حمزہ اصفہانی (وفات 950) کا یہ بیان ہے کہ ایران کے بادشاہ بہرام گور نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ آدھے دن کام کرے اور آدھے دن موسیقی و شراب سے لطف اندوز ہو۔ ایک دن وہ ایک ایسی جماعت سے ملا کہ جس کے پاس شراب تو تھی' مگر وہ موسیقی سے ناواقف تھے۔ اس پر اس نے ہندوستان کے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ وہاں سے کچھ موسیقاروں کو بھیج دے۔ اس کے جواب میں اس

نے بارہ سو موسیقاروں کو بھیج دیا کہ جو پورے ایران میں پھیل گئے۔ ایران میں یہ لوگ ذوت یا نظ (جاٹ) کہلاتے تھے۔

فردوسی کے شاہنامہ میں بھی اس سے ملتی جلتی کہانی ہے کہ ہندوستان سے جو موسیقار آئے انہوں نے ایک سال کے اندر اندر اپنے حصہ کا غلہ کھا لیا' اس پر بادشاہ نے سزا کے طور پر ان سے کہا کہ وہ گھوم پھر کر اور گانا گا کر اپنی روزی کمائیں۔ اس کے بعد سے خانہ بدوشی ان کی زندگی کا حصہ ہو گئی۔

اس خانہ بدوشی کی وجہ سے وہ آبادی اور شہروں اور جنگلوں' ویرانوں' اور بیابانوں میں رہے اور لوگوں کے مقابلہ میں ان کی دوستی' کتوں' بھیڑیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں سے رہی۔ فطرت کے قریب رہنے کی وجہ سے وہ جڑی بوٹیوں اور ان کے خواص سے بھی واقف ہوئے۔

ایران میں جپسیوں کے لئے جو نام مشہور ہوئے وہ ذوت' لولی' اور لوری تھے۔ جب یہ ایران سے شام' فلسطین اور مصر میں گئے تو لوری' نوری ہو گیا۔ اس کے بعد سے جہاں جہاں یہ گئے ان کے لئے وہاں کے ملکوں نے علیحدہ علیحدہ نام دیئے۔

فریزر نے ان کے بارے میں جو تجزیہ کیا ہے وہ دوسری جماعتوں' فرقوں اور گروہوں سے انہیں مختلف کر دیتا ہے۔ مثلاً ان کے ہاں کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہے' کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے کہ جو ان کی اخلاقی قدروں کو متعین کرے۔ کوئی استاد اور راہنما نہیں ہے کہ جو ان کی نسلی روایات کی نگرانی کرے ان کی زبان کا کوئی ایک معیار نہیں ہے۔ ہمیشہ خانہ بدوشی اور گردش میں رہنے کی وجہ سے جہاں جاتے ہیں وہاں کی زبان کے الفاظ ان کی زبان بس آ جاتے ہیں' اس طرح سے ان کے کلچر کی شکل و شباہت بھی بدلتی رہتی ہے۔ خاص 'ت یہ ہے کہ واپس جانے کے لئے ان کی کوئی سرزمین نہیں' ہندوستان سے انہیں کوئی لچسپی نہیں ہے' اور نہ ہی وطن کے بارے میں ان کے ہاں ناسٹلجیا ہے۔ یہی حال ان کا ناریخ سے دلچسپی کا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں۔ اور کسی ایک جگہ سے تعلق نہیں' ں لئے یہ کسی قوم یا سرزمین کی تاریخ کا حصہ بھی نہیں ہیں۔ نہ ہی انہیں اپنی تاریخ سے وئی لگاؤ ہے اور نہ ہی ماضی سے اپنا رشتہ بناتے ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے جپسی روہ ایک ایسے کردار اور خصوصیات کا حامل ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں ہیں۔

یورپ میں ان کا داخلہ باز نطینی سلطنت میں ہوا' یہ قسطنطینہ اور تھریس میں گئے اور پھر یہاں سے بلقان اور یورپ میں۔ یورپ میں ان کا امیج یہ تھا کہ یہ سانپ' ریچھ' کتے پالنے والے' جادوگر اور قسمت کا حال بتانے والے ہیں۔ ان کی شکل و صورت' عادات' اور علیحدگی کی وجہ سے یورپ میں ان کے خلاف تعصب تھا اور عیسائی علماء لوگوں کو منع کرتے تھے کہ ان سے میل جول نہ رکھیں۔

جب یہ بلقان کی ریاستوں' سربیا' بلغاریہ' والاچیا' اور مولڈیا میں آباد ہوئے تو اسی زمانہ میں یہ علاقے ترکوں کے قبضہ میں آ گئے۔ اس زمانہ میں ان کے ساتھ غلاموں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا' مگر چونکہ یہ دستکار' اور ہنرمند تھے' اس لئے ان کی ضرورت بھی تھی اور کوشش کی جاتی تھی کہ انہیں وہاں رہنے پر مجبور کیا جائے۔

یہاں سے ان کے کچھ گروہ جرمنی آئے۔ جرمنی میں غلطی سے انہیں مصر کا باشندہ سمجھا گیا اور ان کے بارے میں یہ مشہور ہوا کہ انہیں مصر سے اس لئے نکالا گیا کیونکہ انہوں نے عیسائی مذہب چھوڑ دیا تھا' اس کی سزا انہیں یہ دی گئی کہ وہ سات سال تک آوارہ گردی کریں' اس کے بعد انہیں دوبارہ سے مذہب میں شامل کیا جائے گا۔

جرمنی میں کچھ لوگوں نے انہیں تاتار سمجھا۔ ان کے کالے رنگ کی وجہ سے ان کے ساتھ تعصب برتا گیا۔ ان کے لباس' انداز' اور اطوار کی وجہ سے جرمنوں میں ان کے خلاف جذبات تھے اور انہیں اجنبی سمجھتے ہوئے ان سے ملنے میں ہچکچاتے تھے۔ جرمنوں نے ان کے لئے جو نام چنا وہ سیگوئین ہے (Zigeunee) اٹلی میں بھی ان کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ لوگ چور اچکے ہیں۔ اس لئے چرچ نے لوگوں کو منع کیا کہ ان سے میل جول نہ بڑھائیں۔

اس وقت یورپ میں ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے حکمرانوں یا پوپ کے فرمانوں کی ضرورت ہوتی تھی کہ جو تحفظ فراہم کرتے تھے۔ اس لئے جپسیوں نے بھی اپنے تحفظ کی خاطر یہ خطوط حاصل کئے' ان میں سے اکثر خطوط فرمان جعلی ہوتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں' یورپ میں جعلی فرامین کی صنعت موجود تھی' اس لئے انہیں یہ آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یورپ میں انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں کسی بھی ملک میں خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ مختلف شہروا

سے نکالا گیا' مختلف ریاستوں میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ ان کے بارے میں یورپ میں جو امیج تھا وہ یہ تھا کہ:

کالے رنگ' لمبے بال' کانوں مین بالیاں پہننے والے' عجیب و غریب لباس زیب تن کرنے والے ہیں قسمت کا حال بتانا' اور ساتھ میں بھیک مانگنا' اگر موقع ملے تو چوری بھی کر لینا ان کی عادات میں داخل تھا گھوڑوں کی تجارت کرنا' اوزار بنانا' اور علاج کرنا' ان کے پیشے تھے۔ اس کے علاوہ رقص و موسیقی سے انہیں بے انتہا شغف تھا۔

فریزر نے اس بات کی جانب نشان دہی کی ہے کہ یورپ کی حکومتوں کی یہ پالیسی تھی کہ آوارہ گردوں اور خانہ بدوشوں کو ایک جگہ آباد کیا جائے تاکہ وہ مفید شہری بن کر کسی کام آ سکیں کیونکہ خانہ بدوشی کی زندگی میں نہ تو ان کے پاس گھر ہوتا تھا' نہ دولت اور جائداد۔ ان کی ضروریات انتہائی محدود ہوتی تھیں جن میں سواری کے لئے گاڑی اور کھانا و سونا' جب انہوں نے ان ملکوں کے قانون کے تحت آنے سے انکار کیا اور ایک جگہ آباد ہو کر معاشرے کے لئے ورک فورس نہیں بن سکے تو ان پر سختیاں کی گئیں' انہیں جیلوں میں رکھا گیا' پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔ جہازوں میں بطور غلام بھیجا گیا اسپین اور پرتگال نے انہیں زبردستی اپنی افریقی اور جنوبی امریکی کالونیوں میں بھیج دیا۔

ان ظالمانہ قوانین اور سختیوں کے باوجود کسی گروہ کا باقی رہ جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے زبردست جذبات موجود تھے۔ لہٰذا اس صورت حال میں انہوں نے جو راستے اختیار کئے وہ یہ تھے کہ ایسی جگہوں میں جایا جائے کہ جو اور لوگوں کے لئے ناقابل پہنچ ہیں۔ جیسے پہاڑ اور جنگل۔ اور جرمنی کی ریاستوں کی سرحدیں اس خیال سے کہ لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں' انہوں نے خود کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر لیا اور جب موقع ملا تو آپس میں مل گئے تاکہ خود کی حفاظت کر سکیں۔

جپسیوں کے بارے میں جہاں یہ تعصبات تھے' وہیں دوسری طرف لوگ ان کے ہنر' دست کاری اور موسیقی و رقص سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ یہ گھومتے پھرتے گاؤں گاؤں جاتے تھے اور گاؤں والوں کو اشیاء فروخت کرتے تھے' ان کے اوزاروں کی مرمت کرتے اور نئے آلات بنا کر انہیں دیتے تھے۔ یہ باہر کی خبریں سنا کر ان کی محفلوں کو جاندار بناتے تھے۔ یہ جب بھی گاؤں میں آتے تو ان کی وجہ سے وہاں رقص و موسیقی کے میلے لگ

جاتے اور لوگوں کو سستی تفریح میسر آ جاتی تھی' جپسیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ انہوں ہے ہر دور اور زمانہ میں اپنے ہنر اور دست کاری کو باقی رکھا اور اسے اپنی روزی کا ذریعہ بنائے رکھا۔

بیسویں صدی میں جب گوبینو اور چمبرلین نے نسل کے بارے میں اپنے نظریات دئے اور یورپ میں نسل پرستی کو فروغ دیا تو اس کا شکار ایک بار پھر جپسی بھی ہوئے۔ اس زمانہ میں ایک بار پھر یورپی ملکوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی خانہ بدوشی کو ختم کر کے انہیں مستقل طور پر آباد کیا جائے۔ اس مقصد کے تحت سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے یہ کیا کہ ان کے بچوں کو زبردستی اٹھا کر لے آئے اور ان کے نام بدل کر ان کی پرورش اور تعلیم کا بندوبست کیا۔ دوسرے جپسیوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنا نام رجسٹر کرائیں اور اپنے پاس شناختی کاغذات رکھیں۔ دوسروں ملکوں نے بھی ان کی آوارہ گردی کو ختم کرنے کے لئے غیر ملکوں میں جانے پر پابندی لگا دی۔ مگر اس کے باوجود وہ ان کی خانہ بدوشی کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکے۔

نازی دور حکومت میں جپسیوں پر تحقیقات کے بعد یہ ثابت کیا کہ وہ نسلی طور پر کم تر' کم ذہین' اور کم صلاحیت کے حامل ہیں' اس لئے ان کا وجود جرمن نسل کے لئے خطرہ ہے۔ لہٰذا نازیوں نے جہاں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں بھیجا' وہاں جپسی بھی اس کا شکار ہوئے۔ مگر جپسیوں کے پاس یہودیوں کی طرح پروپیگنڈا کرنے کی صلاحیت نہیں' اس لئے ان کے ساتھ نازی دور میں جو کچھ ہوا' اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ جرمن حکومت نے یہودیوں کی طرح نہ تو ان سے معافی مانگی اور نہ ہی انہیں جرمانہ کی رقم ادا کی۔

اگر اب حالات بدل گئے ہیں' جپسیوں پر تحقیقات کے بعد لاتعداد کتابیں چھپ چکی ہیں' مگر اس کے باوجود یورپ میں نسلی طور پر ان کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور کلچر میں تبدیلی آ گئی ہے۔ ان کی رومانی زبان ہر ملک میں وہاں کی زبان سے متاثر ہوئی ہے مگر اب تک انہیں معاشرہ سے علیحدہ اور دوسرا سمجھا جاتا ہے۔

مگر تاریخ میں جپسیوں کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جس نے دنیاوی لذتوں' اور دنیاوی آسائشوں پر بھی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے جائداد' دولت' اور شہرت کی بھی خواہش نہیں

کی، نہ تو انہوں نے کسی مذہبی سربراہ کی راہنمائی کو تسلیم کیا۔ ان کی خوشی و مسرت اور زندگی اسی میں ہے کہ وہ مسلسل حرکت اور گردش میں رہیں اور تہذیب و تمدن سے دور فطرت کی تنہائیوں میں رقص و موسیقی سے اپنی زندگی کو رنگین کرتے رہیں۔ یہ مستقل مزاجی جو ان میں ہے، تاریخ میں کسی اور جماعت میں نظر نہیں آتی ہے۔

کیا ماضی ضروری ہے؟

تاریخ اور ماضی کا آپس میں گہرا رشتہ ہے کیونکہ ماضی نہ ہو تو تاریخ بھی نہ ہو۔ اسی ماضی کے سرمایہ کو تاریخ نئے نقطہ ہائے نظر سے پیش کرتی رہتی ہے۔ کبھی یہ سرمایہ معاشرے کے لئے انتہائی اہم ہو جاتا ہے کہ جس کے سہارے وہ زندہ رہتے ہیں' تو کبھی یہ ان کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے کہ جس سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہیں۔ ماضی کے سرمایہ کو کیوں اور کیوں کر استعمال کیا جائے اس کا تعلق تاریخ نویسی پر ہوتا ہے۔ اگر تاریخ نویسی حکمراں طبقوں کے مفادات کے تحت لکھی جاتی ہے تو یہ ماضی کی اس طرح سے تشکیل کرتی ہے کہ اس سے انہیں معاشرہ کو کنٹرول کرنے اور ان پر حکومت کرنے کا جواز مل جائے۔ یہ ان کے لئے ایک مشن اور مقصد کا تعین کرتی ہے اور انہیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اس کے حصول کے لئے لوگوں کا استحصال کریں' ان پر تشدد کریں' اور انہیں اپنے لئے استعمال کریں۔ اس کی ایک مثال ہمارے سامنے اسرائیل کی ہے کہ جو اپنے ماضی کے سرمایہ کے سہارے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تمام فاشسٹ طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہے۔ انہوں نے ماضی میں ہونے والے مظالم کی تاریخ کو اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ ان کے مظالم پر بولنے والے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اسی ماضی کے سہارے وہ فلسطین کی سرزمین پر قبضہ کئے ہوئے ہیں' اور اسی ماضی کے سہارے انہوں نے اپنی توسیع پسندی اور امپیریل ازم کو جائز قرار دیدیا ہے۔ اپنے ماضی کی تشکیل کے لئے وہ آثار قدیمہ کی دریافتوں سے بھی سہارا لے رہے ہیں۔ اور ارض فلسطین پر اپنے قبضہ کو برابر ثابت کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں فلسطینیوں اور عربوں میں تاریخ کے علم کی کمی ہے جس کی رو سے وہ دنیا کے سامنے اپنا مقدمہ موثر انداز میں پیش کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

انفرادی اور گروہی شکل میں کبھی کبھی ماضی کے ایک حصہ کو تو قبول کیا جاتا ہے۔ اور

کچھ کو رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال جنوبی افریقہ کی ہے۔ نیلسن منڈیلا جب صدر بنا تو اس نے فوراً جو بات کہی وہ یہ کہ ماضی کو فراموش کر دینا چاہئے۔ اس کی دلیل صحیح ہے۔ کیونکہ متعصب اور نسل پرست سفید فام حکومت کے دوران وہاں کے لوگوں پر رنگ و نسل کی بنیاد پر جو مظالم ہوئے تھے' انہیں جس طرح سے ذلیل و خوار کیا گیا تھا' اگر اس کی یادیں باقی رہیں تو یہ تلخیاں اس قدر شدید ہیں' اور یہ زخم اس قدر گہرے ہیں کہ سفید اور کالوں میں ان یادوں کے بعد اتحاد ناممکن ہے۔ اس لئے کبھی سیاسی طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماضی کو دفن کر دو۔

یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی دور کے ختم ہونے کے بعد دنیا کی تاریخ میں ایک نئے تصور کا اضافہ ہوا۔ یہ تصور تھا "نئی قوم" کا۔ جو بھی ملک آزاد ہوئے' انہوں نے اپنے ماضی کو رد کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ آج سے ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہے۔ یہ نظریہ نوآبادیاتی ورثہ سے انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوا' اور اس کے تحت وہ اس تاریخ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے تھے کہ جس میں انہوں نے شکستیں کھائیں' ذلتیں برداشت کیں' اور غلامی کے طور پر زندہ رہے۔ اب اس بوجھ کو اتار کر وہ نوجوانی کے جذبہ کے ساتھ ابتداء کرنا چاہتی تھیں۔

یہ نوآبادیاتی ملکوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ جب مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر دیا' تو اس نے بھی عثمانی خلافت کے ماضی سے چھٹکارا پاتے ہوئے ترکی کو ایک نئی قوم کہا' نیا ترکی کہ جو ایک نئے جذبہ کے ساتھ دوبارہ سے پیدا ہوا ہے اور ایک نئی زندگی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

جب امریکہ کی دریافت ہوئی ہے تو یہاں پر ایک بڑی تعداد ان فرقوں' جماعتوں اور گروپوں کی تھی کہ اپنے اپنے ملکوں میں مذہبی' نسلی' یا لسانی بنیادوں پر ستائے گئے تھے' اس لئے امریکہ میں وہ ماضی کو پیچھے چھوڑ کر مستقبل کی تلاش میں گئے تھے۔ ان کے لئے امریکہ جانے کے بعد سے تاریخ نئے سرے سے شروع ہوئی تھی' وہ پرانی یادوں کو بھولنا چاہتے تھے کیونکہ اس میں ان کے لئے سوائے رنج و اندوہ کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے لئے یہ دنیا کی نئی ابتداء تھی' ایک ایسی دنیا کہ جو پرانی کے مقابلہ میں معصوم' گناہوں سے پاک' اور تازہ تھی۔ پرانی دنیا گندگی و گناہوں کے بوجھ سے دبی ہوئی اپنی تازگی اور خوبصورتی کو کھو

چکی تھی۔ ان کی یہ ابتداء ایسی ہی تھی کہ جیسے نوزائدہ بچہ ہو کہ جس کا ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو اور جو صرف آگے کی جانب دیکھتا ہو۔

چنانچہ یہاں پر جیسے جیسے لوگ ہجرت کر کے آتے رہے' وہ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے تھے' نوجوان ہوں یا بوڑھے' ان کے لئے اب مستقبل زیادہ اہم تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ماضی کو فراموش کر کے جب انہوں نے مستقبل کے لئے جدوجہد کی تو ان میں نئی توانائی اور جذبہ آگیا اور اسی جذبہ کے تحت انہوں نے نئے امریکی معاشرے کی تشکیل کی۔ لیکن اس تشکیل نو کے جذبہ میں انہوں نے امریکہ کے قدیم باشندوں اور ان کی تاریخ کو نیست و نابود کر دیا۔ کئی امریکی قبائل کا اس طرح سے قتل عام کیا کہ آج ان کا وجود بھی نہیں ہے۔ ایک نئی تاریخ کو بنانے میں انہوں نے وہاں کے باشندوں کے تمام آثار مٹا دئے تاکہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے۔ آج یہ امریکی قدیم باشندے نمونہ کے طور پر "ریزرویشن" میں رہتے ہیں' تاکہ ماہر علم بشریات کو ان کے مطالعہ کا موقعہ مل سکے۔ اس طرح یہ میوزیم میں رکھے ہوئے نمائشی نمونے ہیں۔

امریکہ میں جن افریقیوں کو غلام بنا کر لایا گیا' اور انہیں جس حالت میں رکھا گیا' اس میں انہیں اپنے ماضی کا کوئی شعور نہیں تھا' اگر کوئی شعور تھا کہ وہ جو کہ سفید مالکوں نے انہیں دیا۔ وہ یہ تھا کہ افریقہ تہذیب سے عاری براعظم ہے کہ جہاں وحشی و غیر متمدن لوگ رہتے ہیں۔ جن کی کوئی ثقافت نہیں' قدریں نہیں' کوئی قدیم آثار نہیں' اور جو انسانیت سے بہت دور ہیں۔ اس وجہ سے یہ کالے غلام اس پر خوش تھے کہ انہیں اس ماحول سے نکال کر مہذب اور متمدن ماحول میں لے آیا گیا ہے کہ جہاں وہ اعلیٰ ثقافت میں رہ رہے ہیں۔ ایک عرصہ تک یہ امریکی کالے باشندے اس نظریہ سے متاثر رہے۔ مگر جیسے جیسے ان میں تعلیم آتی گئی' شعور بڑھتا گیا۔ اسی طرح سے ان میں اپنی ماضی کی تلاش اور جستجو کا شوق ابھرتا رہا۔ جب دوسری جنگ عظیم کے بعد نئے افریقی ملک آزاد ہوئے اور انہوں نے اپنی اہمیت کو منوایا تو اس سے ان امریکی کالوں میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا اور انہیں اپنے ماضی سے شرم کی بجائے فخر پیدا ہوا' یہی وہ جذبہ تھا کہ جس نے الکس ہیلی سے "روٹس" نامی مشہور ناول لکھوایا۔ اب اس وقت ان میں اپنے افریقی ہونے کی شناخت بڑھتی جا رہی ہے' اور وہ اپنے ماضی کی مدد سے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

جو ملک نئے نئے آزاد ہوئے اور جہاں سیاسی استحکام نہیں ہے۔ ان ملکوں میں ہر آنے والی حکومت "قریبی ماضی" کو اپنے لئے استعمال کرتی ہے۔ وہ فوراً ماضی کی حکومت کو الزامات دے کر، اس کی بدعنوانیوں کا ذکر کر کے، نئے دور کی ابتداء کرنی چاہتی ہے۔ عام طور سے لوگوں سے یہی کہا جاتا ہے کہ ماضی کو فراموش کر کے نئی ابتداء کرنی چاہیئے۔ یا ماضی میں جو کچھ ہوا اب اسے نہیں دہرایا جائے گا۔ اس دلیل کو بار بار ہر حکومت دہراتی ہے اور "قریبی ماضی" کے سہارے اپنی حکومت کی زندگی کو طول دینا چاہتی ہے۔ ماضی کے اس استعمال کو دیکھتے ہوئے کسی نے یہ کہا کہ ماضی کو ہونا ہی نہیں چاہیئے۔

تاریخ کیوں ختم ہو رہی ہے؟

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تاریخ کا مضمون اپنی دلچسپی اور افادیت کھو بیٹھا ہے۔ اس وقت کراچی سے لے کر پشاور تک یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کوئی نام مشکل سے ذہن میں آتا ہے کہ جس نے تاریخ میں تحقیقی کام کیا ہو۔ تاریخ پڑھانے والے استاد تو ہیں مگر مورخ نہیں ہیں۔ کیا پاکستان جیسے ملک کے لئے جو 1947ء میں وجود میں آیا' اس کے لئے تاریخ کی ضرورت نہیں تھی؟ اور اگر یہ ضرورت تھی تو اس کو پورا کیوں نہیں کیا گیا۔ تقسیم کے بعد ہمارے حصہ میں جو مورخین آئے ان میں سے اکثر تو وہ تھے کہ جو ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان ہی لوگوں نے پاکستان کی نئی یونیورسٹیوں میں تاریخ کے شعبہ قائم کئے۔ پنجاب یونیورسٹی جو کہ پاکستان کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے اس کے تاریخ کے شعبہ سے جو ہندو یا غیر مسلم تھے وہ سب چلے گئے' ان کی جگہ لینے والے کوئی ایسے مشہور نہیں ہوئے کہ جو اس مضمون میں اضافہ کرتے۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تاریخ کا نصاب اور تحقیق جو علیحدہ علیحدہ شعبے رہے ہیں۔ تاریخ کے نصاب میں کسی قسم کی اہم تبدیلی نہیں کی گئی اور وہی نصاب برقرار رہا کہ جو تقسیم سے پہلے پڑھایا جاتا تھا اس نصاب کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سیاسی تاریخ پر مکمل طور پر انحصار کرتا تھا۔ سماجی' ثقافتی' اور معاشی تاریخ کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔ نصاب میں جن کتابوں کو رکھا گیا تھا وہ بھی اس طرح سے رہیں۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ ایم۔ اے میں طالب علموں کو ثانوی ماخذوں سے ہی پڑھایا جاتا تھا۔ مثلاً سلطنت اور مغل دور کے ہم عصر ماخذوں سے طالب علم ناواقف رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایم۔ اے میں میں نے رش بروک کی بابر والی کتاب' ایشوری پرستاد کی ہمایوں' بینی پرشاد کی جہاں گیر' سکینہ کی جہاں گیر و جادو ناتھ سرکار کی اورنگ زیب والی کتابیں پڑھیں۔ یہی حال دوسری تاریخوں کا تھا کہ جس میں پرانی' اور متروک کتابوں سے پڑھایا جاتا رہا۔

ان یونیورسٹیوں میں بھی کہ جہاں ایم۔ اے میں تحقیقی مقالے لکھوائے جاتے تھے۔ طالب علموں کو ہم عصر ماخذوں کے بجائے ثانوی ماخذوں سے کام چلانے کو کہا جاتا تھا۔ اس لئے ہندوستان کی تاریخ کے طالب علموں کو نہ تو فارسی آتی تھی' اور نہ یہ اس قابل تھے کہ اس عہد کے ستونوں کو پڑھ سکیں۔ یہی حال مسلم تاریخ کے طالب علموں کا تھا کہ جو عربی سے ناواقف تھے۔ یورپی ہسٹری میں تو جرمن' فرانسیسی' یا ڈچ زبانوں کے جاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ یہاں بھی یورپ میں جو نئی تحقیق ہو رہی تھی' اور ان کے انگریزی میں ترجمے ہو رہے تھے' اس سے اساتذہ اور طالب علم ناواقف رہے۔ ہمارے ہاں اب برطانیہ کی تاریخ ساؤتھ گیٹ' اور کارٹر اینڈ میر سے پڑھائی جاتی ہے اور یورپ کی تاریخ میں فشر اب تک قابل احترام ہے۔

پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو نصاب ابتداء سے تھا' معمولی تبدیلیوں کے ساتھ وہ اب تک چلا آ رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک استاد جو 20' سے 30 سال تک ایک ہی چیز پڑھاتا رہتا ہے اور ایک ہی قسم کی نصابی کتابیں پڑھاتا رہتا ہے' اس کی دلچسپی مضمون سے ختم ہو جاتی ہے اور وہ سال بہ سال ایک ہی قسم کے موضوعات کو دہراتا ہے کہ جس میں نہ تو کوئی جذبہ ہوتا ہے' نہ روح' اور نہ لگن۔ اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ وہ نئی تحقیق کرے' نئے سوالات اٹھائے' یا نئے تجزیے کرے۔ نصاب کے اس ٹھہراؤ کی وجہ سے امتحان میں ایک ہی قسم کے سوالات آتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاں یہ فارمولا ہے کہ 5 سال کے امتحان کے پرچے دیکھ لو' اور ان سے سوالات کا انتخاب کر لو۔ کیونکہ 15 یا 20 سوالات ہیں کہ جو ہر سال لوٹ پھیر کے آتے ہیں۔ مثلاً میں سلطنت اور مغل دور کے بارے میں ان سوالات کا پیٹرن لکھتا ہوں۔

> ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا اصل بانی کون تھا' قطب الدین ایبک یا التتمش؟ بلبن کا نظریہ بادشاہت اور انتظام سلطنت۔ علاء الدین خلجی کی اصلاحات' محمد تغلق کے منصوبے۔ فیروز تغلق کی اصلاحات۔ سکندر لودی کی فتوحات و انتظام سلطنت۔ ایک یا دو سوال سلطان کے انتظام سلطنت پر۔ بس۔

مغلوں کے دور حکومت میں: بابر کے حملے کے وقت ہندوستان کی حالت' تو زک بابری'

ہمایوں کی غلطیاں' اکبر اور دین الٰہی' راجپوت پالیسی' منصب داری نظام' نورجہاں کی شخصیت و کردار' شاہ جہاں اور سنہری دور' اورنگ زیب اور بھائیوں کی خانہ جنگی۔ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی' دکن پالیسی وغیرہ اور پھر دو' ایک سوال انتظام سلطنت پر۔

چونکہ اب ان مضامین کو نظریاتی رنگ دیدیا گیا ہے۔ اس لئے شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ پر ضرور سوالات آتے ہیں۔

یہی صورت حال مسلم ہسٹری اور یورپین ہسٹری کی ہے۔ جب ممتحن پرچے بناتا ہے تو وہ بھی تین سال کے پرچوں کو سامنے رکھتا ہے اور پچھلے سال جو سوالات ہیں۔ انہیں چھوڑ کر باقی سوالات کو نقل کر دیتا ہے۔

اس نظام میں جب استاد کو یہ سہولت مل جاتی ہے کہ اسے پڑھنا نہیں پڑے اور طالب علم کو آسانی سے امتحان پاس کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو اس کی بھی دلچسپی مزید مطالعہ کی نہیں رہتی ہے۔ اس وجہ سے تحقیق و جستجو کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے کہ جو کسی بھی مضمون کی دلچسپی کے لئے لازمی ہے۔

نصاب کی اس یکسانیت کے ساتھ ساتھ مضمون کا نظریاتی ہونا بھی اس کی ترقی کے لئے مضر ثابت ہوا۔ چونکہ پاکستان کو ایک نظریاتی ملک قرار دیا گیا اس لئے تاریخ کو اس ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے استعمال کیا گیا. مثلاً ابتداء میں دو قومی نظریہ کا بانی سر سید احمد خاں کو قرار دیا گیا کہ جنہوں نے ہندو و مسلم قوموں کے فرق کو واضح کیا۔ مگر بعد میں اس کی جڑوں کو اور دور تک لے جایا گیا اور اس کی ابتداء شیخ احمد سرہندی سے شروع کی گئی۔ اکبر ایک ہندوستانی قومی نظریہ کا حامی اور سیکولر خیالات کا تھا' تو شیخ احمد سرہندی مسلم شناخت اور اسلام کی برتری کے حامی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شیخ احمد سرہندی کا یہ پہلو اور اس کی دلیل ابوالکلام آزاد کے "تذکرے" سے لی گئی ہے جو کہ خود آگے چل کر ہندی قومیت کے نقیب بنے۔

پاکستان کی تحریک کو جن شخصیات پر رکھا گیا ہے ان کے بارے میں مخالفت کرنا' ان کے تاریخی کردار پر تنقید کرنا قانوناً یا روایتاً ممنوع ہے۔ اس کا تجربہ اکثر مجھے طالب علموں کو پڑھاتے ہوئے ہوا۔ جبکہ طالب علم فوراً یہ کہتے تھے کہ اگر انہوں نے سرکاری نقطہ نظر کے خلاف کچھ لکھا تو وہ فیل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ڈر کا ثبوت ان طالب علموں کے فیل

ہونے سے ہوا کہ جنہوں نے اپنی آزادانہ رائے دی۔ لہٰذا اکثر یہ رویہ طالب علموں اور استادوں میں منافقانہ رویہ کو پیدا کرتا ہے کہ ان کی اپنی جو رائے ہوتی ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ ڈرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں کہ جب تاریخ کو کئی نقطہ ہائے نظر سے لکھا جا رہا ہے اور اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا رہا ہے اس وقت اس موضوع کو ایک ہی نظریہ میں قید کرنا' اس مضمون کی موت ہے۔ اور یہی تاریخ کے ساتھ اس وقت پاکستان میں ہو رہا ہے۔

نصاب کے بعد دوسرا پہلو تاریخی تحقیق کا ہے۔ ایم۔ اے۔ ایم فل' اور پی ایچ ڈی کی تحقیق تو ڈگری کے حصول کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق ہے کہ جو اساتذہ اپنے مضمون میں اپنے پروموشن کے لئے کرتے ہیں' اس کے بعد وہ محقق آتے ہیں کہ جو اپنے شوق' لگن' یا کسی مقصد و نظریہ کی ترقی کے لئے کرتے ہیں۔ ان تمام تحقیقات میں اہم چیز یہ ہے کہ وہ کون سے موضوعات ہیں کہ جن پر کام ہو رہا ہے۔ تحقیق کے اکثر موضوعات کا تعلق تحریک پاکستان ہے۔ ایک تو ہر صوبہ میں تحریک آزادی میں حصہ پر مقالات لکھے گئے جیسے تحریک پاکستان میں صوبہ سرحد' سندھ' بلوچستان اور پنجاب کا حصہ' پھر صوبوں کے بعد ضلعوں اور شہروں کی باری آئی' جیسے ضلع لاڑکانہ کا تحریک آزادی میں حصہ' اور جب ان پر کئی مقالات لکھ لئے گئے تو شخصیات کا نمبر آیا۔ قدیم تاریخ پر جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے کام نہیں کیا۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ پر بھی دو یا چار مقالات لکھے گئے ہوں گے۔

اس بات کی بھی کوشش ہوئی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ موجودہ پاکستان تاریخی لحاظ سے ہمیشہ سے ہندوستان سے علیحدہ رہا ہے۔ اس کی جدا تاریخ ہے اور یہ کبھی کسی ہندو خاندان کے ماتحت نہیں رہا۔ اس نظریہ میں اس وقت تک تو دشواری آ رہی تھی کہ جب تک مشرقی پاکستان ساتھ میں تھا' مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے اس نظریہ کو درست ثابت کرنے میں بڑی مدد دی۔ اور اب اس نظریہ کے حامیوں کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کو ہندوستان سے جدا کر کے ایران اور وسط ایشیا سے ملا دیں۔

اب رہے وہ لوگ کہ جو اپنے پروموشن کے لئے تحقیقی مقالے لکھتے ہیں' تو ان لوگوں کا مقصد تحقیق سے زیادہ یہ ہوتا ہے ایسی چیز لکھیں جو چھپ جائے اور جس سے ان کی

حب الوطنی ثابت ہو' لہٰذا ان کے موضوعات میں بھی تحریک پاکستان کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ چونکہ باہر کے جرنل میں تو یہ تحقیقی مقالات چھپ نہیں سکتے اس لئے یہ یونیورسٹی کے جرنلز' یا مختلف رسالوں میں انہیں چھپواتے ہیں۔ کچھ نے اس کا یہ حل نکالا کہ اپنا ہی ایک جرنل نکال لیا۔ جب اس میں ضرورت کے مطابق مضامین چھاپ لئے تو پھر اسے بند کر دیا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی بنی تھی' جس کے تحت ایک جرنل بھی شائع ہوا کرتا تھا اور کچھ عرصہ اس کے سالانہ سیشن بھی ہوئے' مگر جلد ہی یہ سوسائٹی ایک گروپ کے قبضہ میں آکر ٹھٹھر گئی۔ معین الحق اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے دوستوں اور حمایتوں کو ممبر بنائیں تاکہ ہر سال الیکشن میں وہی منتخب ہوں۔ لہٰذا یہ اس سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری مرتے دم تک رہے۔ ان کے مرنے پر یہ سوسائٹی بھی ختم ہو گئی۔ اب یہ جرنل ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت چھپتا ہے۔

کئی بار اس کی کوشش بھی ہوئی کہ ہسٹری کانگرس کی بنیاد ڈالی جائے مگر ایک آدھ سیشن کے علاوہ یہ کانگرس بھی نہیں چل سکی۔ ان ناکامیوں کے بعد اس کے احیاء کی کوششیں بھی ترک ہو گئیں۔

ایوب خاں کے زمانہ میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ "تاریخ پاکستان" کے نام سے پاکستان کی جامع تاریخ لکھی جائے۔ چنانچہ اس موضوع پر تین جلدوں میں جو کتاب تیار ہوئی اس کے جنرل ایڈیٹر اشتیاق حسین قریشی تھے اور اس کے لکھنے والوں میں اس وقت کے تمام مشہور مورخین تھے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ان مورخین کی سطحیت' بدذوقی اور تاریخ کے علم سے پوری ناواقفیت' کھل کر سامنے آتی ہے۔ ان لوگوں نے بھی کہ جو اپنے مضمون کے ماہر تھے' بالکل بوگس مضامین لکھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ یہ ان سے زبردستی لکھائے گئے ہیں۔ بہرحال اس کتاب نے پاکستان کے مورخین کا کھوکھلا پن دنیا کے سامنے ظاہر کر دیا ہے۔

پاکستان میں ایسے محققین بھی ہیں کہ جن کی اس علم میں پوری تربیت نہیں ہے' مگر انہیں تاریخ سے شوق ہے اور اس شوق کی خاطر یہ لوگ اپنے طور سے جو بھی محنت ہو وہ

کر کے تحقیق کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں جذبہ تو سچا ہے' مگر انہیں اپنی تحقیق کو پیش کرنے کا سلیقہ نہیں آتا ہے۔ لیکن یہ لوگ غنیمت ہیں کہ جو تاریخ کو سہارا دئے ہوئے ہیں۔

حال ہی میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے' وہ یہ کہ ایسے خاندان کے جس کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اپنے خاندان اور خاندان کے بزرگوں کو تاریخ میں اعلٰی مقام دلانے کے لئے' اپنے خاندان' اور بزرگوں پر تاریخ لکھوا رہے ہیں۔ اب چونکہ مورخوں کی زبردست کمی ہے اس لئے یہ کام صحافی' اور ادیب کر رہے ہیں' اس بہانہ سے انہیں کچھ پیسہ کمانے کا موقع مل جاتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی تاریخیں لکھوانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعریف و توصیف کی جائے' لہٰذا قصیدوں پر مبنی یہ کتابیں دوسرے تو کیا پڑھیں گے' مگر ان کے خاندان والے ضرور اس تاریخ سے اپنے خاندان کی عظمت کا سرٹیفکیٹ ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ان کے خاندان میں کوئی سیاستداں بھی ہو تو اسے تحریک آزادی کا نامور کارکن بنا کر پاکستان کی تشکیل میں ان کو بھی حصہ دار بنا دیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اس "انٹی ہسٹری" رجحان کی کیا وجہ ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جب تک تاریخ کو بادشاہوں' حکمرانوں' اور شخصیتوں کی تاریخ کے طور پر رکھا جائے گا اور اسے معاشرہ کی جامع تاریخ کے طور پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک لوگوں کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔

تاریخ کو ایک ہی نقطہ نظر سے لکھنے کی وجہ سے بھی اس میں یکسانیت آ جاتی ہے۔ ایک ہی قسم کے دلائل بار بار دئے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جاتا رہے گا تو بھی تاریخ کی دلکشی باقی نہیں رہے گی۔

ایک اور اہم وجہ ہماری تاریخ سے نفرت کی یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران اس ملک کی ابتداء سے لے کر اب تک سازشوں' بدعنوانیوں اور جرائم میں مصروف ہے۔ لہٰذا وہ نہیں چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ان کے یہ مکروہ چہرے آئیں۔ اورنگ زیب نے بھی اپنی حکومت کے دس سال بعد درباری مورخ کے عہدہ کو ختم کر دیا تھا۔ اس کی بھی خواہش نہیں تھی کہ اس کے عہدے حکومت کے بارے میں آنے والی نسلوں کو پتہ چلے۔

اس کے بعد وہ مورخین اور اسکالرز ہیں کہ جو غیر ملکی یونیورسٹیوں میں ہماری تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ اول تو ان محققین کے اپنے عزائم ہوتے ہیں' اور ان میں سے اکثر اپنی

حکومتوں کو بین الاقوامی تعلقات کے لئے اس مواد کو فراہم کرتے ہیں۔ یہاں ان ہی موضوعات پر کام ہوتا ہے کہ جس کا تعلق ان کے مفادات سے ہوتا ہے۔ پھر اہل مغرب' مشرق کو ہمیشہ سے اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اس میں نوآبادیاتی دور کی نعمتیں اور مغربی تہذیب کے فوائد شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب ہمارے ہاں اپنے تاریخی سرمایہ میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے تو اس میں ان اسکالرز کی کتابوں کو پڑھا جا رہا ہے اور انہیں پڑھ کر ہم اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو ماضی پر کنٹرول کرتا ہے وہ حال پر اپنا اثر جماتا ہے' اور جو حال پر اثر جماتا ہے وہ مستقبل کا مالک ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے ہم نے اپنی سیاست' اور معیشت کو غیر ملکیوں کے حوالہ کر دیا ہے۔ اسی طرح سے ہماری تاریخ بھی ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔

تاریخ کا موضوع ویسے بھی کئی نشیب و فراز سے گذرا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ادب اور تاریخ کا آپس میں گہرا رشتہ تھا اور مورخ جب واقعات کو بیان کرتا تھا تو وہ اپنا زور بیان صرف کر دیتا تھا۔ جب تک اسلوب اور طرز تحریر ادبی نہ ہو اور بات کو پیچیدہ بنا کر نہ لکھا جائے کوئی اسے مورخ اور ادیب ماننے پر تیار نہیں تھا۔ اس اسلوب اور طرز تحریر سے تاریخ نے خود کو بڑی مشکل سے آزاد کیا اور واقعات کو شہادتوں کی بنیاد پر پیش کرنے کو ضروری خیال کیا۔ لیکن جب تاریخ خود آزاد ہوئی تو اسی کے بطن سے اور کئی علم آزاد ہوتے چلے گئے۔ جیسے آثار قدیمہ' علم بشریات' اور عمرانیات وغیرہ ان علوم کی اپنی علیحدہ شناخت کے بعد تاریخ کے لئے اور مشکل کام تھا کہ اب کون سے ایسے موضوعات ڈھونڈے جائیں' اور کون سے ایسے طریقوں کو اختیار کیا جائے کہ یہ اپنی علیحدگی اور شناخت کو برقرار رکھ سکے۔

اسی لئے تاریخ میں نئے نئے مکاتیب فکر پیدا ہوئے' تاریخ کے موضوع کو وسیع کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کوشش کی گئی کہ تاریخ کو معاشرے اور اس کے عمل سے متعلق کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا علم باقی رہا۔ اور اس وقت باقی رہے گا کہ جب تک اس کا رشتہ معاشرہ سے اور لوگوں سے رہے گا۔ ایک مشہور مورخ مارک بلوخ کا کہنا ہے کہ اگرچہ تاریخ میں داستانیں' واقعات اور دیومالائی قصے تو پرانے ہو گئے' مگر اس کے پاس تجزیہ کرنے کی صلاحیتیں ایسی ہیں کہ جو برابر بدلتی رہتی ہیں اور تاریخ کو نیا پیراہن پہناتی رہتی

ہیں۔

لیکن ایک اور مورخ جے۔ ایچ بلمب (Plumb) کا کہنا ہے کہ دنیا اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے کہ اس میں تاریخ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ زراعتی اور کمرشل معاشروں کے برعکس صنعتی معاشرے میں تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس میں لوگ ماضی سے زیادہ مستقبل کی جانب دیکھتے ہیں۔

یہ تبدیلیاں اور تیزی سے بدلتے حالات تاریخ کے لئے ایک چیلنج ہیں۔ کیا تاریخ اس سے عہدہ برآ ہو سکے گی یا یہ بھی ماضی کے اور بہت سے علوم کی طرح جن میں سحر' جادو' کیمیا' علم نجوم و ستارہ شناسی کی طرح بے وقعت ہو کر ختم ہو جائے گا؟

تاریخ کی زندگی اسی میں ہے کہ یہ بھی بدلتے حالات کے تحت خود کو بدلتی رہے تاکہ یہ معاشرہ پر بوجھ نہیں بنے' بلکہ اس کی راہنمائی کرے۔

حصہ سوم

ہم تاریخ سے کیوں نہیں سیکھتے؟

لڈل ہارٹ

تعارف

ہم تاریخ سے کیوں کچھ نہیں سیکھتے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ کیا تاریخ کے پاس ہمیں سکھانے کے لئے کچھ موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر تاریخ کے پاس ماضی کے تجربات و واقعات ہیں کہ جن سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ان سے نہیں سیکھتے۔ یا یہ کہ ہم سیکھتے تو ہیں۔ مگر وہ کہ جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ وہ نہیں سیکھتے کہ جو دوسرے خواہش کرتے ہیں۔ جہاں تک تاریخ میں ماضی کے سرمایہ کا سوال ہے تو اس میں اس قدر وسعت اور بو قلمونی ہے کہ اس میں ہر طبقہ اور ہر فکر کے لوگوں کے لئے سیکھنے کا مواد موجود ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بعض اوقات سیکھنے کا معیار کامیابی و ناکامی سے لگایا جاتا ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ تاریخ میں جو لوگ کامیاب ہوئے انہوں نے ماضی سے سیکھا اور جو ناکام ہوئے وہ اس لئے کہ انہوں نے تاریخ سے کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی' اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کامیابی و ناکامی کا تعلق ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے یا زمانہ حال کے حالات سے۔

ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ یہ جملہ اکثر اوقات ہم اس وقت کہتے ہیں کہ جب ہم کسی بحران سے دوچار ہوتے ہیں یا کسی المیہ کا سامنا کرتے ہیں۔ اس وقت جب ہم گزرے ہوئے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تو نہ صرف ہماری غلطیاں سامنے آتی ہیں بلکہ تاریخ سے بہت سے ایسے واقعات بھی ذہن میں آتے ہیں کہ جو حال سے مشابہت رکھتے ہیں' اکثر بعد

میں پچھتایا جاتا ہے کہ ان غلطیوں کا تدارک اس وقت ہی کیوں نہ کر لیا گیا' کیا اس کی وجہ ہماری تاریخ سے ناواقفیت ہے یا ہمارا جھوٹا اعتماد کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم وہ غلطیاں نہیں دہرائیں گے کہ جو ہم سے پہلے والے کر چکے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ لوگ تاریخ سے سیکھتے ہیں مگر وہ صرف وہ باتیں سیکھنا چاہتے ہیں کہ جن سے ان کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ ایک آمر تاریخ سے سیکھتا ہے کہ وہ کس طرح موثر انداز میں عوامی قوت کو دبائے۔ وہ غلطیاں نہ دہرائے کہ جو اس سے پہلے والوں نے کی تھیں۔ ایذا رسانی' دہشت انگیزی اور جبر کی روایات کو سختی کے ساتھ نافذ کیا جاتا ہے۔ ہٹلر مسولینی یا نپولین کی سوانح عمریاں ان کے مطالعہ میں رہتی ہیں کہ کس طرح سے انہوں نے مخالف تحریکوں کو ختم کیا۔ اپنے فوجی جنرلوں پر قابو پایا۔ اور پروپیگنڈے کے ذریعہ اپنی شخصیتوں کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ یہ ان سوانح عمریوں سے یہ نہیں سیکھتے کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ اکثر آمروں کا انجام وہی ہوتا ہے جو ان سے پہلے والوں کا ہوا' مگر ان میں سے ہر آمر یہی سمجھتا ہے کہ وہ بالکل محفوظ اور مستحکم ہے۔

اس طرح تاریخ تمام طبقوں کے لئے مواد فراہم کرتی ہے' ان کے لئے بھی کہ جو غیر جمہوری طریقوں سے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور پھر اس اقتدار کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی کہ جو مطلق العنانیت اور جبر کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ تاریخ انہیں حوصلہ دیتی ہے کہ وقت ان کے ساتھ ہے۔ ظلم واذیت کے مایوس کن حالات میں تاریخ ان کی راہنمائی کرتی ہے اور وہ ہر بار ایک نئی توانائی کے ساتھ ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہاں تک جبر کا نظام خستہ ہو کر گر جاتا ہے اور ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ اس لئے تاریخ میں مایوسی سے زیادہ امید کا پیغام ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا جنگ ہمارے تمام مسائل کے حل ہے؟ ہندوستان کے مسلمانوں نے جو جنگی ذہنیت تاریخ سے ورثہ میں پائی ہے' کیا ان میں اتنی اہلیت اور ہمت ہے کہ وہ اسے بدل سکیں؟ کیا ہم تاریخ سے کچھ سیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ ہماری جنگ جو ذہنیت نے ماضی میں ہمیں نقصانات پہنچائے۔

کیا اس کے نتیجہ میں ہم آگے چل کر بھی نقصان نہیں اٹھائیں گے؟ ہمیں سنجیدگی سے

اس تجزیہ کی ضرورت ہے کہ ہم میں جنگجو یا نہ ذہنیت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے پس منظر میں ہماری پوری تاریخ ہے۔ مسلمان ہندوستان میں بطور فاتح کے داخل ہوئے' اور جنگ و جدل اور قتل و غارت گری سے یہاں حکومت قائم کی۔ اس پورے عرصہ میں کہ جب تک وہ اقتدار پر قابض رہے انہوں نے ہر مخالف کو فوجی طاقت و قوت سے کچل کر رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسائل کا حل گفت شنید سے' افہام تفہیم سے' اور بات چیت سے نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں قوت برداشت پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی مخالف کو برداشت کرنے کا حوصلہ - ہر مخالف ہمیں اپنا دشمن نظر آتا ہے۔ اور ہر اختلاف رکھنے والے کو ہم غدار سمجھتے ہیں۔ ہم شدت کے ساتھ اس کے خواہش مند ہیں کہ ہمارے خیالات و نظریات میں یکسانیت ہو' اختلاف نہ ہو۔ انتہا پسندی ہماری ذہنیت کو تشکیل کرتی ہے اور دہشت کے ذریعہ ہم ہر متضاد مخالف چیز کو تہس نہس کر دینا چاہتے ہیں۔ جنگ جو یا نہ ذہنیت کے یہ وہ اثرات ہیں کہ جو ہماری شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور یہ اس لئے کہ تاریخ میں ہم نے جنگوں کو ہمیشہ استحسان کی نظروں سے دیکھا ہے۔ ہم نے بہادری اور شجاعت اس کو سمجھا ہے کہ کس نے کتنے دشمنوں کو قتل کیا۔ اور خون ریزی میں کون سب سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ دشمنوں کی کھوپڑیوں کے میناروں میں ہم نے اپنی عظمت و بڑائی ڈھونڈی' ہم نے ان لوگوں کو اپنا ہیرو بنایا کہ جنہوں نے زیادہ سے زیادہ خون ریزی اور لوٹ مار کی تھی۔ ہمارے ہیروز کی فہرست میں سیاستدان' عالم' مفکر' سائنسدان اور ادیب و شاعر نظر نہیں آتے۔

جنگ جو یا نہ ذہنیت کی یہ جڑیں ہماری تاریخ میں بڑی گہری ہیں۔ اس کے پس منظر میں عربوں' ایرانیوں' اور ترکوں کی سامراجی اور توسیع پسندی کی جنگیں ہیں۔ یہ جنگیں اس قدر ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئیں کہ ہماری زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ' محاورے اور کہاوتیں بھی اس جنگ جو یا نہ ذہنیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ محبت کی باتیں بھی جنگی ساز و سامان اور اسلحہ کی زبان میں ہونے لگیں۔ محبوب کی نگاہیں تیر بن گئیں۔ اس کی ابروئیں کمان' اس کی نظریں نشتر و تلوار۔ اور جب وہ ادھر ادھر نظریں ڈالتا تو ہر طرف میدان جنگ کا سماں نظر آتا کہیں قتل ہوئے لوگ ہوتے اور کہیں نیم جان و بسمل۔ جب بات یہاں تک ہو جائے کہ محبوب بھی ہتھیار بند ہو جائے۔ تو اس کے بعد جنگ قابل فخر

اور باعث عزت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے کامیابی و ناکامی کی شکل میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ جنگ کو صرف جنگ سمجھا جاتا ہے۔

یہ جنگ جو یا نہ ذہنیت تاریخی ورثہ کے طور پر ہماری شخصیت کا ایک حصہ بنی ہوئی ہے۔ آپ اخبار پڑھ لیجئے اور اس کی سرخی سے اس ذہنیت کا اندازہ لگا لیجئے۔۔۔۔ کچل دیا جائے گا۔۔۔۔ ختم کر دیا جائے گا۔۔۔۔ نبٹ لیں گے۔۔۔۔ وغیرہ' یہ جملے صرف دشمنوں کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے سیاسی حریفوں کے لئے بھی ہوتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد اس جنگی ذہنیت کو اور فروغ ملا' ہندوستان سے ہم نے دو بڑی جنگیں لڑیں' مگر ان دونوں جنگوں سے ہم نے کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان جنگوں کی تاریخ کو سچائی و صداقت سے لکھ کر اپنی کمزوریوں کو تسلیم کیا۔ بلکہ اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا کر خود ہر الزام سے آزاد ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے حکمراں طبقوں کے لئے یہ جنگ جو یا نہ ذہنیت بڑی مفید ہے' جنگ کے جذبات کو اس قدر شدت سے پیدا کرتے اور انہیں ابھارتے ہیں کہ لوگ اپنے دکھ' درد اور محرومیوں کو بھول جاتے ہیں اور فوجی اخراجات کے لئے شدید غربت اور جہالت کو قبول کر لیتے ہیں۔

تاریخ تو ہمیں سکھانے کو تیار ہے۔ مگر کیا اس سے حکمراں طبقے وہ سیکھیں گے کہ جو ان کے مفادات کے خلاف ہے؟ تاریخ یہ سکھاتی ہے کہ جو قوم خود اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ ہو اسے کوئی فوج' اسلحہ اور ہتھیاروں کے انبار تباہی سے نہیں بچا سکتے۔ قوم اس وقت اپنا دفاع کرے گی جب معاشرہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اسے تعلیم دے گا اور اس کی مادی ضرورتیں پوری کرے گا' ورنہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر طبقوں اور گروہوں میں بٹ جائے گا۔ اور حکمراں طبقے تنہا و اکیلے رہ جائیں گے۔ جب عوام اور حکمراں طبقوں میں فاصلے بڑھ جائیں تو پھر اکیلے یہ اپنا تحفظ نہیں کر سکتے۔ فوج اگر عوامی ادارہ نہیں رہے' اور مراعاتی طبقہ بن جائے یہ تنہا ملک و معاشرہ کا دفاع نہیں کر سکتا ہے۔

تاریخ کے پاس وہ سارا مواد ہے کہ جس سے ہم سیکھ سکتے ہیں۔ اس علم میں اتنی اہلیت ہے کہ یہ ہمیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس سے سیکھنا چاہتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک علی

پیش لفظ

جن خیالات کا میں یہاں پر اظہار کر رہا ہوں، اگر ان کی کوئی اہمیت ہے تو اس کی وجہ میرے وہ ذاتی حالات ہیں کہ جن سے میں زندگی میں دوچار ہوا۔ معاشرے کی اکثریت کی طرح میں بھی اس پر مجبور ہوا کہ میں زندہ رہنے کے لئے کچھ کام کروں لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اپنے روزگار کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ میں واقعات کی سچائی کو بیان کروں۔ بجائے اس کے کہ اس سچائی کو چھپاؤں۔ جیسا کہ بہت سے لوگ اپنی مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ یا ان کی ملازمت انہیں اس کام پر مجبور کرتی ہے۔

تاریخ کی اہمیت

تاریخ انسان کے آگے کی جانب قدم بڑھانے اور اس کی غلطیوں کا ایک ریکارڈ ہے۔ تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ انسان کے قدم آہستہ ہوتے ہیں اور ساتھ میں وہ غلطیاں بھی کرتا جاتا ہے' مگر اس کی غلطیاں تیزی سے سرزد ہوتی ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں وہ مواد فراہم کرتی ہے کہ جس سے ہم اپنے آباؤاجداد کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمیں اپنی کم مائگی کا احساس ہے اس لئے ہم دوسروں کی غلطیوں پر انہیں قصوروار نہیں ٹھہراتے۔ لیکن یہ ضرور ہونا چاہئے کہ اگر ہم خود کوئی غلطی کریں تو اس پر خود کو نہ صرف قصوروار ٹھہرائیں بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔

یہ رجحان عام طور سے پایا جاتا ہے کہ تاریخ کا علم ایک خاص علم ہے اور اس پر بولنے کا حق صرف مورخوں کو ہے۔ دیکھا جائے تو اس علم کو نہ سمجھنے کی یہ پہلی غلطی ہے۔ اگر غور کریں تو تاریخ وہ علم ہے جو دوسرے تمام علوم کی اصلاح کرتا ہے' یہ ایک ایسا علم ہے کہ جس کا دائرہ کار پھیلا ہوا ہے۔ اور اس میں زندگی کے تمام پہلو آ جاتے ہیں' تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کس طرح اقوام نے بار بار ایک ہی طرح کی غلطیوں کو دہرایا ہے اور وہ غلطیاں آخر کون سی تھیں؟ تاریخ کا یہ پہلو اس طرح سے ہماری تعلیم کو ایک اہم عنصر دیتا ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اس سے کچھ سیکھ سکیں خصوصیت سے ان لوگوں کے لئے کہ جو خود کو عملی آدمی سمجھ کر "نظریہ ساز لوگوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ جرمنی کے چانسلر نے بڑا طنز بھرا جملہ کہا ہے "وہ بیوقوف ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ وہ اپنے تجربوں سے سیکھتے ہیں' میں تو دوسروں کے تجربات سے سبق حاصل کرتا ہوں" تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس کے مواقع فراہم کرتا ہے کہ ہم دوسروں کے تجربوں سے سیکھیں کیونکہ تاریخ میں ایک لامحدود' وسیع انسانی تجربہ ہوتا ہے جو کہ انفرادی تجربہ سے زیادہ پھیلا ہوا اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔

تاریخ کیا دریافت کرتی ہے؟

زمانہ حال میں انسان ذاتی تجربہ سے جب واقعات ہوتے ہوئے اور انہیں بنتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس سے اسے جو شعور ملتا ہے اس کی روشنی میں وہ ماضی میں ہونے والے واقعات اور ان کی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے کچھ تھوڑی بہت تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا ہے' اگرچہ میں ان واقعات سے دور تھا۔ مگر میں نے ان کا مشاہدہ کیا اور بہت سارے واقعات کو اپنے سامنے ہوتا ہوا دیکھا۔ اس تجربہ نے مجھے یہ سکھلایا کہ واقعات کے ہونے میں اکثر حادثاتی عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ واقعات کہ جنہوں نے تاریخی عمل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اکثر لنچ کے وقت میں ہوئے ہیں۔ میں نے لندن اور جنیوا میں بہت سی کمیٹیوں میں یہ دیکھا کہ کس طرح سنجیدہ مسائل پر بحث یکدم رک گئی' یا اس کے فیصلے میں تبدیلی آگئی' یا جلدی جلدی بغیر سوچے سمجھے ایک فیصلہ کر لیا گیا کیونکہ کمیٹی کے اراکین کو لنچ کے لئے جانا تھا اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے مسئلہ پر بحث کریں اور اس کے تمام پہلوؤں کو دیکھیں۔ اس کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مخالف رکن گھڑی کی سوئی کو آگے بڑھا کر اپنے مطلب کا فیصلہ کمیٹی سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ نپولین نے یہ بات کہی تھی کہ فوج پیٹ کی خاطر مارچ کرتی ہے۔ مگر میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ "تاریخ سیاستدانوں کے پیٹ کی خاطر آگے بڑھتی ہے۔

جاپانیوں کا خیال ہے کہ انسان کی جرات اس کے پیٹ میں ہوتی ہے' اور اس کی تصدیق فوجی تاریخ سے بھی ہوتی ہے کہ کس طرح فوجوں کے لڑنے اور جنگ کرنے میں ان کی بھوک کو دخل رہا ہے بلکہ دیکھا جائے تو انسان کے جذبات کا صحیح مقام بھی یہی ہے۔ ان تمام باتوں کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو ایک مورخ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ تمام واقعات کہ جنہوں نے قوموں کی زندگی بدل ڈالی وہ کسی متوازن فیصلہ کے نتیجہ میں نہیں

ہوئے۔ بلکہ ان کے پس منظر میں وقتی اور جذباتی فیصلے تھے۔ اور اکثر تو بہت نچلے درجہ کی معمولی ترجیحات۔

تجربہ نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ کس طرح سے تاریخ کی تشکیل کا عمل ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ نقلی تاریخ کی تشکیل۔ مثلاً 1914 اور 1918 کی جنگ مورخوں کی تربیت کا میدان ہے۔ حکومتوں نے اپنی دستاویزات شائع کر دی ہیں۔ سیاستدانوں اور جنرلوں نے اپنے منہ کھولے ہیں تاکہ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بیان کریں' اس لئے اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ان بیانات کو دوسری شہادتوں پر پرکھا جا سکے اور ان کا تجزیہ کیا جا سکے۔ میرا بیس سال کا تجربہ اس بات کی طرف لے جاتا ہے کہ یہ تمام تاریخ جو دستاویزات کی بنیاد پر تشکیل ہوئی ہے۔ اس کو اگر دیو مالائی کہانیاں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ابھی تک جو مورخ ان دستاویزات کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں ان کو میں یہ کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ جب 1918ء میں برطانوی محاذ کھولا گیا اور فرانسیسی امداد وہاں پہنچنے لگی۔ تو ایک مشہور فرانسیسی جنرل فوجی کیمپ کے دورے پر آیا' اور اس نے بڑے شاہانہ انداز میں حکم نامہ پڑھنا شروع کر دیا کہ رات کو کس مورچہ پر فوج تیار رہنا چاہئے اور کس طرح صبح کے وقت انہیں حملہ کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اس کے اس حکم کو سننے کے بعد کمانڈر نے بڑی پریشانی کے عالم میں کہا "مگر یہ مورچہ تو جرمن فرنٹ کے پیچھے ہے' اور اسے تم کل گنواں چکے ہو"۔ اس پر بڑے جنرل نے مسکراتے ہوئے اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اسے سب کچھ معلوم ہے کہا "یہ تاریخ کے لئے ہے" اس موقع پر یہ اضافہ کرنا مناسب ہو گا کہ یہ جنرل جنگ کے دوران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ اور فوجی تاریخ کی جو دستاویزات تیار ہوئیں ان میں اس کا بڑا اثر ہے۔

ان سرکاری دستاویزات میں بہت بے ربطی اور خالی جگہیں ہیں' کیونکہ دستاویزات کے وہ حصے تباہ کر دیئے گئے جن سے کسی کمانڈر کی شہرت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور اس سے زیادہ مسئلہ ان جعلی دستاویزات کی نشان دہی کرنا ہے کہ جنہوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ مجموعی طور پر برطانوی کمانڈروں میں اختراع یا اپچ کی صلاحیت نہیں۔ اس سے بہتر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دستاویزات کو ضائع کر دیا جائے' بجائے اس کے کہ ان میں تبدیلی کی جائے۔ فرانسیسی اس کے مقابلہ میں نکتہ رس ہیں۔ ایک جنرل احکامات کو لکھ کر اپنے

سپاہیوں کی جان کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور اپنی شہرت کو بھی بچا سکتا ہے' کیونکہ اس کے ان احکامات کا تعلق اس صورت حال سے ہوتا ہے کہ جس میں نہ تو کوئی حملہ کیا گیا نہ لڑائی ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی واقعہ ہوا' اور اس طرح ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور یہ تحریری احکامات سرکاری دستاویزات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا ہے کہ یہ جنگ آخر کس طرح سے لڑی گئی۔ یا لڑی بھی گئی یا نہیں کیونکہ میرا تجربہ تو یہ تھا کہ کمانڈروں کی اکثریت اپنے وقت کا زیادہ حصہ مورخوں کے لئے مواد تیار کرنے پر صرف کرتی تھی۔ اگر ماضی کے بڑے لوگ بھی ہماری موجودہ نسل کی طرح تاریخ کے سلسلہ میں باشعور تھے' اور وہ بھی اسی طرح دستاویزات کو بدلتے رہتے تھے۔ تو واقعی یہ مسئلہ قابل غور ہو گا کہ کس حد تک ماضی کے ان قدیم ماخذوں پر بھروسہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کی حقیقت کو جاننے کے لئے تو ہمارے ذرائع بھی اب محدود ہیں۔

دیکھا جائے تو تاریخ کی دریافتوں سے ایک نئے قسم کا تجربہ ہوتا ہے' اس لئے مشہور امریکی مورخ ہنری آدم نے ایک خط کے جواب میں کہا تھا کہ "میں نے تاریخ پر بہت کچھ لکھا ہے مگر اس لئے نہیں کہ اس پر یقین بھی کروں۔ اگر کوئی مجھ سے اختلاف کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ متفق ہونے پر تیار ہوں۔" خاص طور سے جنگ کی تاریخ ایسی ہے کہ جس میں مجموعی طور پر واقعات کی صداقت پر یقین کرنا اور لوگوں کی شہادت کو تسلیم کرنا مشکل ہوتا ہے' کیونکہ اس میں واقعات کو اس طرح تشکیل دیا جاتا ہے کہ جو پروپیگنڈے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

اس لئے ایک مورخ کے لئے سب سے مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ سچائی کو دریافت کرے' اس مشکل کام سے بچنے کے لئے دوسرا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ جھوٹ کیا ہے؟ تاریخی شہادت کو پرکھنے اور جانچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دعوی کو تنقیدی طور پر دیکھے اور اس پر شبہ کرے' بجائے اس کے کہ مقابلہ میں اعتراف پر یقین کرے۔ ایک کہاوت ہے کہ "آدمی اپنے اعتراف کے بعد مجرم ٹھہرتا ہے"۔ اس کہاوت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم تاریخی حقائق اور ان کی سچائی کو جانچ سکتے ہیں۔

سائنسی طریقہ کار

اگرانسان خود کو حالات کے مطابق تبدیل کرتا رہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں ترقی کرنے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کا دار و مدار اس کے رویہ اور رجحان پر بھی ہے۔ موجودہ دنیا کے مسائل اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا کھلے ذہن سے مطالعہ کیا جائے اور سائنسی طور پر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذہن تمام تعصبات سے پاک ہو' اور فہم و ادراک اور متوازن جذبات کے ذریعہ وہ حالات کو دیکھے اور سمجھے۔ واقعات سے متعلقہ عناصر کو دیکھنا' ان کو جانچنا' اور ان کے ایک دوسرے سے جو روابط ہیں ان کا جائزہ لینا' صرف اس صورت میں ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہم ایک متوازن فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ فہم و ادراک کا ہونا بنیادی طور پر ایک تحفہ ہے۔ اسی طرح توازن کو قائم رکھنا۔ لیکن ان دونوں کی نشوونما اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ خود کو تمام تعصبات سے بالکل آزاد کیا جائے اور یہ کام ایک فرد کا ہے کہ وہ اپنی قوت اور جرات سے خود کو آزاد کرے' میرا یقین ہے کہ ہر فرد میں صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ہر قسم کے تعصبات سے پاک کر سکتا ہے۔ اس کے بعد واقعات کی طرف متوجہ ہو' اگر وہ مسلسل خود تنقید کرتا رہے اور اس بات کی کوشش کرے کہ اپنے بیان کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے تو اس صورت میں وہ سچائی کو پانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کے بارے میں کہ جس میں اسے دلچسپی ہے کوئی تنقید پڑھتا ہے یا سنتا ہے' تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کا پہلا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ اس تنقید پر جذباتی رد عمل کا اظہار کرتا ہے' یا وہ اس کو بھدا مذاق کہتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ اس کے خراب اثرات ہوں گے' اور یہ سوال نہیں کرتا کہ "کیا یہ سچ ہے؟" تو اس طرح وہ اپنے غیر سائنسی رویہ کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مسئلہ کو خود اپنے نقطہ نظر سے

دیکھنے کی بجائے مصنف کی نظر سے دیکھتا ہے' اور وہ کہتا ہے کہ اتھارٹی صحیح ہے کیوں کہ ہر اتھارٹی پر اعتبار کرنا چاہیے اگر وہ اظہار رائے کو حقائق سمجھ لے اور یہ دعویٰ کرے کہ کسی بھی رائے کو سوال نہیں کیا جا سکتا ہے' اگر وہ یہ اعلان کرے کہ کوئی خاص واقعہ کبھی وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا' یا یہ کہے کہ خاص نقطہ نظر بالکل صحیح ہے' تو اس صورت میں اس کا ذہن اور نقطہ نظر قطعی سائنسی نہیں ہو سکتا۔ سچائی تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ شک و شبہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے معروضی تجسس کا ہونا لازمی ہے کسی بھی سوال کو اگر موضوعی طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا جواب ہمیشہ ادھورا رہے گا۔

لنگ منگ اکیڈمی کی جانب سے جو مشہور کتابیں چھاپی گئیں ان کے ہر صفحہ پر یہ موٹو لکھا ہوتا تھا "طالب علم کو چاہیے کہ ہر مسئلہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھے"۔ اس نقطہ نظر کو 11 ویں صدی کے چانگ سائی نے واضح انداز میں اس طرح سے پیش کیا کہ "اگر تم ان نکات پر شک کرو کہ جن پر اور دوسرے لوگ یقین کرتے ہیں' تو اس کا مطلب ہے کہ تم ذہنی طور پر ترقی کر رہے ہو"۔

سچائی کا خوف

تاریخ سے ہم نے یہ سیکھا ہے کہ ہر زمانے کے اور ہر دور میں کسی بھی علاقہ کے رہنے والوں کی اکثریت کے سامنے اگر ان کے اداروں پر تنقید کی جائے یا ان کی کمزوریاں بتائی جائیں تو وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ ہم نے یہ بھی سیکھا ہے کہ جب لوگ سچائی کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کے اس عمل سے جھوٹ کو نہ صرف تقویت ملتی ہے بلکہ اس کے خراب اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگوں سے ملتے ہیں کہ جو کسی بات کو سن کر یہ کہتے ہیں "کیا یہ سچ ہے؟" جب تک آدمی کے ذہن میں سچائی پوری طرح سے موجود نہ ہو اس وقت تک صحیح معنوں میں ترقی ناممکن ہے۔

اس کے برعکس 1936 کے جرمن پینل کوڈ کو لیجئے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ اگر جرمن تاریخ سے اس قسم کا مواد چھاپا جائے کہ جس سے جرمن قوم کی عزت و عظمت پر حرف آتا ہو تو چاہے وہ واقعات صحیح کیوں نہ ہوں' ایسا مواد تلاش کرنے اور چھاپنے والے کو سخت سزا دی جائے۔ سچی تاریخ لکھنا ان لوگوں کے لئے کہ جو سچائی کو چھپانا چاہتے ہیں ہمیشہ سے ناراضگی کا باعث رہا ہے۔ لیکن جرمن پہلا ملک تھا کہ جس نے اسے جرم بنا دیا۔ اور اس کی وجہ سے تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ آگے چل کر نقصان بھی اٹھائے گا۔

اس سے زیادہ خطرناک رجحان کہ جس کے تحت تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے وہ قومی اور فوجی مفادات ہوتے ہیں۔ 1935 میں ایک مشہور جرمن جنرل نے اپنے ملک کے فوجی رسالہ میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ہم دھوکہ کیوں نہ دیں؟" اس مضمون کا یہ مقصد نہیں تھا کہ دشمن کو کیمو فلاج کے ذریعہ دھوکہ دیا جائے اور اس طرح اس سے فوجوں کی حرکت چھپائی جائے' بلکہ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن سے ان ناخوشگوار واقعات کو چھپایا جائے کہ جن کے جاننے سے ان پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ پچھلی جنگ کی دستاویزات کو حاشیہ پر قیصر کی ہدایات کے ساتھ مکمل

طور پر چھاپ دیا گیا۔ اس وجہ سے آگے چل کر جو بھی فوجی تاریخ لکھی جائے گی وہ ان دستاویزات پر ہو گی' اور اس کی وجہ سے تاریخ میں ایسے واقعات آ جائیں گے جو جرمن فوج کی عظمت کو گھٹ دیں گے' مثلاً آخر یہ کیوں لکھا گیا کہ مشرقی یورشیا کے محاذ پر جرمن فوجیں گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے ہٹ گئیں یا یہ کہ سڑکیں بھاگنے والوں کی ٹرانسپورٹ کی وجہ سے بند ہو گئی تھیں؟ آخر یہ کمزوری کیوں غیر ملکیوں اور نوجوان جرمن فوجیوں پر ظاہر کی گئی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر جو غلطی کی گئی وہ یہ تھی کہ ہائی کمانڈ کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی۔ جب کہ یہ فیصلہ کرنے والے چھ یا آٹھ ملین جرمنوں میں سے صرف 6 تا 18 افراد ہوتے ہیں۔ اس لئے کیا ضرورت تھی کہ ان کی کمزوری کو طشت از بام کیا گیا؟ اگر تاریخ کو اس طرح سچائی کے ساتھ لکھا جائے گا تو یہ ہر نوجوان کے جذبات کو ٹھنڈا کر دے گی۔ اور زندہ رہنے کی جو خوشیاں ہیں وہ ختم ہو جائیں گی۔ جنرل نے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ کو لکھتے وقت اسے بھی کیمو فلاج کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مشہور انگریزی مقولہ ہے کہ "سچائی وہ ہے جو کہ کام کرتی ہے"

اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جس تاریخ پر "سرکاری" لکھا ہو' تو اس کو پڑھتے وقت بہت سی شرائط کو ذہن میں رکھنا ہو گا اور اگر تاریخ "فوجی" بھی ہو تو اس صورت میں احتیاط اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر تاریخ کو پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دھوکہ دینے کا فن فوج سے بہت پہلے تاریخ میں شروع ہو چکا تھا۔

اس قسم کی کیمو فلاج و دھوکہ دینے والی تاریخ بہت سی ایسی کمزوریوں اور غلطیوں کو چھپا لیتی ہے کہ دوسری صورت میں انہیں دور کیا جا سکتا تھا یا ان پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ جھوٹ ایک سطحی اور بے بنیاد اعتماد پیدا کرتا ہے' اور اس کی وجہ سے تاریخ میں قوموں کو شکست اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر یہ جھوٹا اعتماد فوجیوں میں پیدا کر دیا جائے تو اس کے نتیجہ میں جنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال 1914 کی پہلی جنگ عظیم ہے۔ اس جنگ سے چند ہفتوں پہلے کی تاریخ پڑھ لیجئے اور آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ جنگ ان لوگوں نے شروع کی جن کو سچائی کا پتہ نہیں تھا اور جن میں جھوٹا اعتماد تھا۔

سچائی سے انکار

تاریخ سے ہم یہ بھی سیکھتے ہیں کہ لوگ پونٹس پلاٹ کے کہنے کے مطابق سوال کی
ش میں رہتے ہیں کہ سچائی کیا ہے؟ میرا اپنا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ہماری عادت ہے کہ ہم
پنے مفادات، مقصد، خواہشات، یا ارادوں اور روایات کی خاطر اس کی کوشش کرتے ہیں
ہ سچائی کو چھپائیں یا اسے مسخ کریں۔

1914ء اور 1917 کی تاریخ میں اس کی لاتعداد مثالیں ہیں۔ مثلاً انگریز کمانڈر ہیگ نے
دعوی کیا تھا کہ وہ جنگ کو تنہا ہی جیت کر دکھائے گا۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حملہ
نے والا تھا۔ محاذ کی صورت حال بالکل بدل گئی۔ اور فرانسیسی کمانڈروں نے اس حملہ کے
ے میں شک و شبہ کا اظہار کیا، لیکن ہیگ نے اپنی اس شدید خواہش کے تحت کہ اسے
کی اجازت ہو۔ اس نے کابینہ کے سامنے ناموافق حالات و واقعات کا کوئی تذکرہ نہیں
۔ اور صرف ان واقعات کی نشان دہی کی کہ جو اس کے حق میں جاتے تھے۔

اس کو انجینئرنگ اسٹاف کے لوگوں نے متنبہ کیا "پسرے کا علاقہ دلدلی ہے، اور اگر
علاقہ میں بمباری کی گئی تو پانی کی نکاسی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ موسمیات
ماہروں نے اسے آگاہ کیا کہ 80 سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر سال اگست کے شروع
فلینڈر کے علاقہ میں زبردست بارشیں ہوتی ہیں۔ اور بارشوں کے بعد اس کی مشکلات
اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اس نے کابینہ کے سامنے ان میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں
۔ بلکہ اس کی بجائے اس نے جرمن فوجوں کی تھکاوٹ کو بیان کیا۔ جب کابینہ نے اسے
کہ ان حالات میں جب کہ لوگوں کی سخت ضرورت ہے وہ کوئی ایسا خطرہ مول لینا نہیں
تے کہ جس کے نتیجہ میں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان ہو۔ تو اس نے کابینہ کو یقین دلایا کہ
د بھی نہیں چاہتا کہ اس قسم کی محاذ آرائی میں ملوث ہو کہ جس سے جانی نقصان ہونے
طرہ ہو۔ جب کابینہ نے اس سے پوچھا کہ آخر بغیر فرانسیسی مدد کے وہ کیوں جنگ کرنا

چاہتا ہے۔ تو اس نے کابینہ کو یقین دلایا کہ فرانسیسی اس کی موثر طور پر مدد کرنے کو تیار
ہیں۔ حالانکہ اس نے اپنے کمانڈروں سے پرائیویٹ طور پر یہ کہا تھا کہ فرانسیسی اس کی مدد
کرنے کو تیار نہیں۔ جب اس نے جولائی کے آخری دن حملہ کیا تو اسے مکمل طور پر ناکامی
کا سامنا ہوا۔ لیکن اس نے لندن جو رپورٹ بھیجی اس میں کہا کہ وہ اپنی کامیابی سے پوری
طرح مطمئن ہے۔

جب وزیراعظم اس حملہ میں ہونے والے نقصان سے پریشان ہو کر فلینڈر کے محاذ پر
گئے تو اس نے جرمن فوج کے ان قیدیوں کو جو گرفتار کئے گئے تھے۔ ان کی جسمانی حالت کو
بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کا یہ دعویٰ کہ جرمن فوج تھکی ہوئی تھی، صحیح تھا۔ جب
وزیراعظم نے ان قیدیوں کو دیکھنے کی خواہش کی تو ہیگ کے اسٹاف میں سے ایک نے فون کر
کے یہ ہدایات دیں کہ صحت مند قیدیوں کو جیل کی کوٹھریوں سے کہیں اور منتقل کر دیا
جائے۔ اس طرح دھوکہ دینے کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ 4 لاکھ جانیں اس میں ضائع
ہوئیں۔ بعد میں ہیگ یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے محاذ اس لئے کھولا تھا کہ اسے فرانسیسیوں
نے مدد کا یقین دلایا تھا۔ اگرچہ اس دوران میں اس نے جو خطوط لکھے تھے اس میں فوج کی
ہمت اور حوصلہ کی تعریف کی تھی، مگر جب اس کی فوج حملوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور
مکمل طور پر تباہ ہو گئی تو اس نے اس کا سارا قصور وار حکومت کو ٹھہرا دیا۔

ہیگ ایک باعزت آدمی تھا۔ لیکن اس کے حملہ کے نتیجہ میں جو نقصانات ہوئے اس
کے پس منظر میں خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے والا' دھوکہ تھا۔ اور اپنے اس رویہ سے اس
نے اپنے ماتحتوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اسے وہی بتائیں کہ جس کی وہ خواہش رکھتا
تھا اور اس طرح سچائی چھپا کر اسے دھوکہ دیں۔

اندھی وفاداریاں

یخ سے ہم سیکھتے ہیں کہ جو لوگ افسروں سے وفا داری نہیں کرتے' وہ اپنے ماتحتوں
یتے ہیں کہ ان سے وفا دار رہیں۔ وفاداری ایک اچھا وصف ہے' مگر اس وقت تک
تک اس کو آنکھیں بند کر کے اختیار نہ کیا جائے۔ لیکن وفاداری کا لفظ استعمال
تے بہت زیادہ مسخ ہو گیا اور اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مطلب ہے "نا اہلوں کے
اہی گٹھ جوڑ"۔ اس طرح یہ ایک خود غرضانہ صفت بن جاتی ہے۔ ایک خوشامدانہ
لہ جس میں آقا اور خادم دونوں ہی خود کو ذلیل کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کے
ں بنیاد جھوٹے اور خود غرضانہ رشتوں پر ہوتی ہے۔

وفاداریاں تاریخ میں بھی داخل ہو جاتی ہیں' اور اس طرح سے اسے نقصان پہنچاتی
رخوں کا اصول یہ ہے کہ سچائی کو سچائی کی خاطر تلاش کیا جائے۔ اس پیشہ میں
وں کی خاصی تعداد ہے لیکن ان میں سے معدودے چند ہیں کہ جنہیں صحیح معنوں
خ کہا جاسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر جذباتیت کے مارے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان میں
ی جذباتیت نہیں کہ جو تاریخی سوانح حیات لکھنے والوں میں ہوتی ہے کہ جو رشتہ
ستی یا عقیدت کے تحت لکھتے ہیں۔ مگر مورخ کے لئے جذبات کا بوجھ سچائی کی
ں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس سے نچلی سطح پر وہ ہیں جو کہ اپنے نتائج اپنے سامعین
ست کی خوشنودی' کے تحت نکالتے ہیں۔

ا جائے تو تاریخ کے لکھنے اور تاریخی سچائی میں ایک گہری خلیج حائل ہے اور یہ
یت سے فوجی تاریخ میں سب سے زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک
ہی جا سکتی ہے کہ فوجی تاریخ لکھنے والے اکثر غیر تربیت یافتہ فوجی ہوتے ہیں۔ کہ
علت سے ذاتی رشتہ اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے
ں لکھ سکتے۔ لیکن دراصل اہمیت ذہنی شعور کی ہے۔ کیونکہ ایک سپاہی کے لئے

اہمیت اس بات کی ہے کہ "میرا ملک، صحیح یا غلط ہو، میرا ملک ہے" اس کی وفا داری اپنے ملک، فوج اور رجمنٹ سے اس قدر گہری ہوتی ہے کہ تاریخ لکھتے ہوئے وہ ایک مورخ کی طرح صرف سچائی کے ساتھ اپنی وفاداری کو بر قرار نہیں رکھ سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے غیر جانبدار مورخ بھی مکمل سچائی کو اپنی تحریر میں نہیں بیان کر سکتے لیکن وہ سچائی کی جانب ذہنی یکسوئی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ جو فوجی تاریخ کے ایک لکھنے والے نے کہا کہ جو واقعات پسند نہ ہوں، انہیں چھوڑ دیا جائے۔ ان میں سے اکثر فوجی افسر باعزت لوگ ہیں۔ مگر وہ اس سے واقف نہیں کہ واقعات کو چھوڑ کر یا انہیں مسخ کر کے وہ گناہ کر رہے ہیں، اور یہ گناہ صرف ان کے ملک ہی کے خلاف نہیں بلکہ سچائی کے خلاف بھی ہے، جو کہ در حقیقت عزت و احترام کی بنیاد ہوتی ہے۔

اندھی اتھارٹی

ہم سب ہی حماقت کی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے جو عقل مند ہیں انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک رجحان یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرے۔ اس سلسلہ میں پہلی جنگ عظیم سے بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جب پیرس میں وردون کے محاذ کی کمزوری کی اطلاع پہنچی' تو یوفر سے اس بات کی یقین دھانی چاہی گئی کہ وہ ان کمزوریوں کو دور کرے۔ اس نے ناراضگی کے لہجہ میں جواب دیتے ہوئے اس بات سے انکار کیا کہ تشویش کی کوئی وجہ ہے' اور اس نے مطالبہ کیا کہ اسے ان لوگوں کے نام بتائے جائیں کہ جنہوں نے یہ شکایات کی ہیں۔ میں ان ساتھیوں اور فوجیوں کو برداشت نہیں کر سکتا کہ جو میرے ماتحت ہیں' اور میرے رابطہ کے بغیر انہوں نے براہ راست حکومت کو میرے بارے میں شکایات لکھی ہیں۔ اور میرے احکامات کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اس سے فوج کا ڈسپلن بری طرح متاثر ہوا ہے۔

اس جواب کو ضروری ہے کہ دنیا بھر کے دفتروں میں آویزاں کیا جائے۔ تاکہ اس ذہنیت کی مکمل تصویر سامنے آ سکے۔ دو مہینہ کے اندر اندر اس کی معصومیت کا نظریہ دھڑام سے نیچے آگرا اور اس کے خراب اثرات فوج پر ہوئے۔

افسروں اور عہدے داروں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ معصوم ہیں' لیکن اگر اس دھوکہ کو نہ سمجھا جائے تو اس سے زندگی کے ہر پہلو میں نقصانات ہوتے ہیں۔

حکومت کی فطرت

تاریخ سے ہم یہ سیکھتے ہیں کہ جو لوگ صاحب اقتدار لوگوں پر یا حکمران طبقہ پر تنقید کرتے ہیں ایسے لوگوں کو اکثر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اگرچہ تمام حکومتوں کا یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ پاکیزگی و نفاست اور سچائی کے معیار کو توڑیں اور ان میں دخل اندازی کریں' ایسا کرنا کچھ حکومتوں کی فطرت ہوتی ہے اس لئے ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ حکومت کے اعمال و افعال پر کڑی نظر رکھے' اور حکومت کو اس بات کی اجازت نہ دے کہ اس کے بنیادی حقوق کو غصب کرے۔ یہ ایک ایسی برائی ہے کہ جس پر مسلسل نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

حکومت کی اقسام

تاریخ سے ہم سیکھتے ہیں کہ جمہوریت معاشرہ کو پابند رسوم بناتی ہے' اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ ان لوگوں کو پسند کرتی ہے کہ جو لوگ فکری طور پر کم سوچتے ہیں' اور ان لوگوں سے ناراض ہوتی ہے کہ جو "نااہل لوگوں کے گٹھ جوڑ" کو خراب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نظام میں اوسط ذہین رکھنے والے کامیاب ہوتے ہیں' اور جو کہ ذہن اور باصلاحیت ہوتے ہیں ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مطلق العنانیت ہے۔ کہ جس کا مطلب ہے حماقت کی مکمل فتح۔ لہٰذا ان دو برائیوں میں سے جمہوریت قابل ترجیح ہے لہٰذا یہ بہتر ہے کہ باصلاحیت خود کو اوسط درجہ کے ذہن کے ماتحت بننے پر قبول کر لے' بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے قیام میں مدد کرے جس میں حماقت پورے طور پر غالب اور جس میں قابلیت' بے ایمانی کے سہارے اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے۔

آخر برطانیہ میں وہ کون سی خوبی ہے کہ جس کی وجہ سے اس کا دفاع کیا جائے' یہ اس کی آزادی کی روایت ہے کہ جس کی وجہ سے اس معاشرہ اور ملک کی توانائی برقرار ہے۔ ہماری تہذیب بھی یونانیوں کی طرح آزادی' اور اتھارٹی پر تنقید کا درس دیتی ہے' اب اگر کوئی اس کے بجائے اہلیت کی خاطر کسی دوسرے نظام کو قائم کرنے کی بات کرتا ہے تو اس طرح سے وہ اس اہم روایت سے غداری کرتا ہے۔

نا اہل جمہوریت بھی ہر قسم کی آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ آمریت آگے چل کر نہ صرف نا اہلیت کا باعث بنتی ہے بلکہ روح کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ کس طرح سے ایک آمر کے قابل اور باصلاحیت مشیر و مددگار آہستہ آہستہ نا اہلیت و بد عنوانی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ جمہوریت کے لئے کسی حد تک سچائی کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی وسعت میں کئی چھوٹے چھوٹے آمر پیدا کرتی ہے۔ لیکن نوکر شاہی کا یہ رجحان جو جمہوریت میں پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے' وہ اس وقت بھی برقرار

رہتا ہے کہ جب کوئی آمر پارلیمنٹ کو منسوخ کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتا ہے۔ ایک آمر اس پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے حمایتوں کو اعلیٰ اور اچھی ملازمتیں فراہم کرے۔ اور جب جمہوریت کے خاتمہ کے بعد پارلیمنٹ اور پریس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شکایات بیان کرنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ تو پھر ان چھوٹے چھوٹے آمروں اور اتھارٹی کی خرابیوں کو دور کرنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک آمر کہ جس کی حکومت مطلق العنانیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے وہ اس پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے اقتدار اور ان کی طاقت کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ وہ پارلیمنٹ کے مقابلہ میں ان پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ نوکر شاہی کے اقتدار اور ان کے اختیارات کو اس وقت تک باقی رکھتا ہے' جب تک کہ وہ اس کی ذات سے وفاداری کا اظہار کرتی ہے اور اس کی حکومت و اقتدار کو باقی رکھنے میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ آمرانہ طرز حکومت کے بارے میں اس بات میں بڑی صداقت ہے کہ "بڑے پسو کی پیٹھ پر چھوٹے پسو کاٹتے ہیں' اور ان سے چھوٹے پسوؤں کی پیٹھ پر ان سے چھوٹے۔"

آمر بننے کا تاریخی عمل

اقتدار میں آنے کی غرض سے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر بااقتدار حکومت کے خلاف لوگوں کی مخالفت کو ابھارتے ہیں یا کوشش کرتے ہیں کہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں اختلافات بڑھائے جائیں۔

وہ بااقتدار حکومت پر سخت حملے کرتے ہیں اور اس کے ہر عمل پر تنقید کرتے ہیں' اور لوگوں میں حکومت کے خلاف جو بے اطمینانی ہوتی ہے' اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں سے آئندہ کے لئے بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں (کامیاب ہونے کے بعد وہ ان وعدوں میں سے صرف چند پر عمل کر پاتے ہیں اور بقیہ کئے ہوئے وعدے جلد ہی بھول جاتے ہیں)۔

وہ ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ انہیں حکومت اور تمام سیاسی اختیارات صرف محدود وقت کے لئے چاہئیں (بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ ان کے اقتدار چھوڑنے کا وقت کبھی نہیں آتا)۔

وہ لوگوں کے جذبات کو یہ ظاہر کر کے ابھارتے ہیں کہ ان کی حکومت کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں' اور اس کو بطور حربہ استعمال کرتے ہوئے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے ان حمائیتوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں' کہ جن کی مدد سے وہ اقتدار میں آئے تھے' اچانک ان پر راز ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مدد کرنے والے ملک کے غدار ہیں۔ لہٰذا انہیں اقتدار سے علیحدہ کر دیا جائے۔

وہ کسی نہ کسی بہانے سے تنقید پر پابندیاں عائد کرتے ہیں اور اسے سخت سزا دیتے ہیں کہ جو سچے حقائق کو پیش کرنے کی جرات کرتا ہے انہیں سچائی سے زیادہ یہ فکر ہوتی ہے کہ ان کی پالیسی پر تنقید نہ ہو۔

ضرورت پڑتی ہے تو وہ مذہب کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اگر مذہبی علماء ان کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے تو وہ ایسا فرقہ پیدا کرتے ہیں' یا اس کی حمایت کرتے ہیں' جو ان کی مکمل طور پر حمایت کرے۔

وہ حکومت کا پیسہ بے دردی سے ایسے کاموں پر خرچ کرتے ہیں کہ جو لوگوں کو نظر آئے اس طرح وہ لوگوں کی روح اور فکر کی آزادی کو لوٹ کر اس کا معاوضہ دیتے ہیں۔

وہ ملک کی کرنسی کو ساز باز کر کے اس طرح سے استعمال کرتے ہیں کہ حکومت کی معاشی حالت مستحکم نظر آئے' اگرچہ حقیقت میں وہ ایسی ہوتی نہیں ہے۔

جب حالات زیادہ خراب ہو جاتے ہیں تو اندرونی صورت حال سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ جنگ شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگ بے اطمینانی اور بیرونی معاملات میں الجھ کر رہ جائیں۔

لوگوں میں اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی غرض سے وہ وطن پرستی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے لئے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ ریاست کے ڈھانچہ کو مزید بڑھاتے ہیں جب کہ اس کی بنیادوں کو کمزور کرتے ہیں' ان کے دور حکومت میں با عزت لوگوں کی جگہ خوشامد اور مفاد پرستوں کو اعلیٰ عہدے ملتے ہیں' یہ لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے شاندار اور سنسنی خیز منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں اور حقیقت سے گریز کرتے ہیں' اس طرح لوگوں میں حقیقت پسندی کی بجائے رومانوی تصورات کو ابھارتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ادارہ اور ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اگر خود آمر کے زمانہ میں ٹوٹ پھوٹ مکمل نہ ہو تو اس کے جانشینوں کے زمانہ میں یہ عمل پورا ہو جاتا ہے۔

یہ سیاسی عمل ہر عہد اور زمانہ میں دھرایا جاتا ہے' اور نئی نسل میں یہ کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو سچ ہے کہ یہ مشکل ہی سے ناکام ہوتا ہے۔

بنیادی نقص

ان تمام باتوں کے باوجود اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ آمرانہ حکومتوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے ہیں۔ بہت سی سماجی اصلاحات اور ترقیاتی کام چند سالوں میں مکمل کر لئے جاتے ہیں۔ جب کہ انہیں کاموں کے لئے دور جمہوریت میں کئی نسلوں تک بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک آمر کی مقبولیت اور لوگوں میں اس کے لئے حمایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تعمیرات عامہ کرائے' آرٹ و ادب کو فروغ دے اور آثار قدیمہ کی دریافتیں کرائے۔ دیکھا جائے تو پارلیمانی حکومت میں ان پہلوؤں پر اس لئے زور نہیں دیا جاتا کہ ان کاموں سے ان کو ووٹ نہیں ملتے۔ آمرانہ حکومتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ معاشرہ کی خدمت کا جذبہ بیدار کر کے لوگوں میں کیمونٹی کا احساس ابھارتے ہیں۔ لیکن اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے جنگ کے دوران لوگوں میں باہمی تعاون و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن اوپر کے چند لوگ سازش اور گٹھ جوڑ کے ذریعہ بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس طرح خراب ذرائع و وسائل کے کوئی اچھے نتائج نہیں نکلتے۔

یہ انسانی فکر ہے کہ جس نے تاریخ میں انسانی ترقی کو آگے بڑھایا ہے اور اسے ایک نئی توانائی دی ہے۔ اس لئے ایک سوچنے اور محسوس کرنے والا انسان ہمیشہ آمرانہ حکومت کی ہر طرز کا سخت مخالف ہو گا کیونکہ اس کی فکر کے لئے اتھارٹی ہمیشہ رکاوٹ بنے گی۔

ایک پر خلوص لکھنے والا ہمیشہ آمرانہ حکومت کی مخالفت کرے گا کیونکہ یہ حکومت سنسر شپ پر یقین رکھتی ہے اور یہ قرون وسطی کے طریقوں پر ایمان رکھتی ہے کہ جس میں کتابوں کو جلانا بھی شامل ہے۔

ہر سچا مورخ بھی اس کا مخالف ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس حکومت میں وہی پرانی غلطیاں دھرائی جاتی ہیں۔ اور شعوری طور پر تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو

مسائل کو سائنسی انداز سے حل کرنا چاہتا ہو' وہ اس کا مخالف ہو گا' کیونکہ یہ حکومت تنقید کو برداشت نہیں کرتی جو کہ سائنس کے لئے ایک لازمی چیز ہوتی ہے۔

مختصراً" یہ کہ وہ شخص جو سچائی کا متلاشی ہے وہ اس کے خلاف ہو گا کیونکہ یہ سچائی کو ریاست کے مفاد کے ماتحت کر دیتی ہے۔ فاشسٹ نظریہ ہمیشہ ٹھہرا ہوا اور منجمد ہوتا ہے جب کہ لبرل فکر متحرک ہوتی ہے۔

لیکن محض فاشزم کی مخالفت کافی نہیں' اور نہ ہی محض آزادی کا دفاع۔ اگر ہم صرف ایک جگہ ٹھہرے رہے تو ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ فاشزم کے ذریعہ جو منفی نتائج نکلتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے آزادی کو آگے بڑھانا ضروری ہے۔ ہم لوگ جو کہ آج تھوڑے بہت آزاد ہیں۔ وہ نتیجہ ہے ہماری پرانی نسلوں کی جدوجہد کا جو انہوں نے 17ویں' 18ویں' اور 19صدیوں میں کی تھی' اب ہمارا کام ہے کہ اس جدوجہد کو آگے بڑھائیں اور سماجی' معاشی اور سیاسی حالات کو بدلیں تاکہ آنے والی نسلیں مکمل طور پر آزاد ہو سکیں۔

جبر کا دھوکہ

ہم تاریخ سے سیکھتے ہیں کہ جبر کے طریقے اور ذرائع عملی طور پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی آزادی میں دخل دیتا ہے تو اس صورت میں اسے روکنا' اور اس کے عمل پر پابندیاں عائد کرنا صحیح ہو سکتا ہے' لیکن کسی آدمی کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کام کرے۔ یہ طریقہ اکثر کامیاب نظر آتا ہے کیونکہ اکثر اس کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو تذبذب کے عالم میں ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ان لوگوں کے لئے ہو کہ جو اپنی مرضی کے خلاف کام پر تیار نہ ہوں تو پھر ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیسٹ کرنا کہ کیا جبر کامیاب طریقہ ہوا یا نہیں' اس کی مثال اس کام سے مل سکتی ہے کہ جسے زبردستی کرایا گیا ہو۔

کام کرنے کی اہلیت جذبہ اور جوش سے ابھرتی ہے اور جذبہ یا جوش جبر سے تضاد رکھتا ہے' اور جبر جذبہ کو مار دیتا ہے۔ کوئی فرد یا قوم جس قدر آزاد ہو گی' اس قدر اس میں جبر کے اثرات سے مایوسی اور تلخی پیدا ہو گی یہ منطقی نتائج ہم تاریخ کے تجربات سے نکالتے ہیں۔ مثلاً جدید دور کی جبری بھرتی کی ابتداء فرانس سے ہوئی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی وجہ انقلاب کا پیدا کردہ جذبہ و جوش تھا۔ چند ہی نسلوں میں یہ اس قدر غیر مقبول ہو گئی کہ نپولین کے زوال کے بعد اکثریت کا مطالبہ تھا کہ اسے منسوخ کر دیا جائے۔ اسی دوران میں یہ پروشیا میں متعارف ہوتی کہ جہاں اسے نشونما پانے کا بہتر ماحول مل گیا اور آدھی صدی کے اندر اندر پروشیا نے جو فوجی فتوحات حاصل کیں اس کی وجہ سے اسے دوبارہ سے فرانس میں مقبولیت مل گئی۔ اور اسے دوبارہ سے نپولین سوم کے زمانہ میں فرانس میں نافذ کر دیا گیا کیونکہ اس وقت لوگ نوکر شاہی کی مداخلت کے عادی ہو چکے تھے۔ فرانس میں آزادی کا جو جذبہ پھر سے پیدا ہوا اس کی وجہ نوکر شاہی کی مطلق العنانیت تھی' مگر اس بوجہ سے فرانسیسی خود کو کبھی بھی مکمل طور پر آزاد نہیں کرا سکے' بلکہ ان کوششوں کے نتیجہ

میں ان کے ہاں بد عنوانی پیدا ہو گئی' کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر جبر کو نظرانداز کیا جائے گا تو اس کی وجہ سے کرپشن کو فروغ ملے گا۔

آج اس بات کو عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ نوکر شاہی کے اختیارات کے نتے میں فرانس کی تیسری جمہوریت میں بد عنوانی خوب پھیلی۔ لیکن اگر اس کا بغور تجزیہ جائے تو اس کی جڑیں فرانسیسی انقلاب میں ملیں گی۔ کہ انہوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا کہ جو بنیادی طور پر ان کے نظریات کے مخالف تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید بھرتی کے اصول نے جرمنی کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا ہو' کیونکہ وہ پہلے ہی سے قانون و ضابطوں کے پابند تھے اور ان کے ہاں آزادی کی روایات گہری نہیں تھی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ نازی تحریک ایک رضاکارانہ تحریک تھی۔ اور جرمن فوجوں کے اہم سیکشنوں' جن میں ایر فورس اور ٹینک فورس شامل ہے' وہ نیم رضاکارانہ بنیادوں پر تشکیل دی گئی تھیں۔ اور اس کی کم شہادت ہمارے پاس موجود ہے کہ جرمن عوام میں ان کے لئے کوئی جذبہ یا جوش تھا بلکہ اس کے شواہد موجود ہیں کی جبری بھرتی جرمن فوج کی ظاہری قوت کے پیچھے ایک کمزوری تھی۔

میں نے جو 25 سال جنگ کے بارے میں مطالعہ کیا ہے اس نے جبری بھرتی کے بارے میں میری روایاتی سوچ کو بدل دیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ جبری طریقے نا اہلیت کو پیدا کرتے ہیں اس لئے جبری بھرتی کا اصول فرسودہ اور ناقابل عمل ہے۔ خصوصیت سے موجودہ زمانے میں جبکہ تعداد سے زیادہ مہارت اور جذبہ و جوش کی ضرورت ہے۔

جبری بھرتی موجودہ جنگ کے حالات میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ کامیابی انفرادی طور پر ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی ہے' جبکہ جبر میں انفرادی صلاحیتوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص کہ جس سے زبردستی کام کرایا جائے وہ صورت حال سے اس قدر تلخ ہو جاتا ہے کہ اس کا پروپیگنڈا کر کے وہ پورے ماحول کو غیر متوازن کر دیتا ہے اور بالاخر اس سے کام کے عمل میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جبری بھرتی سے جنگ کا آغاز تو ہو جاتا ہے مگر اس سے جنگ کے عمل میں تیزی نہیں آتی۔ جبری بھرتی کی وجہ سے 1914ء کی جنگ شروع ہوئی' کیونکہ ایک مرتبہ جب جبری بھرتی کے ذریعہ فوج بنا لی گئی تو اس نے پورے معاشرہ کی زندگی کو متاثر کیا اور ایک ایسا ماحول

پیدا کر دیا کہ جس میں صلح کی گفت و شنید ناممکن ہو گئی' کیونکہ "تمام بندی کا مطلب ہے جنگ"۔ جنگ کے دوران اس کے اثرات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے روسی' آسٹروی جرمن' فرانسیسی' اور اطالوی فوجیں ناکام ہوئیں۔ اس مقابلہ میں سب سے زیادہ کامیاب جنگ کرنے والے آسٹریلین فوجی تھے کہ جنہوں نے جبری بھرتی کو رد کر دیا تھا۔ اور جن میں اندھی وفاداری اور اطاعت بھی نہیں تھی۔

جبر کا پھیلاؤ

فاشزم سے لڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ آزادی کے لئے معاشرہ میں گہرا شعور ہو۔ ہم اگرچہ فاشزم کے لئے تو سہی مگر اس کے ساتھ ہی آزادی کے لئے ہمارا عقیدہ پختہ نہیں تھا' اور اس کے بجائے ہم نے بھی دشمن کے اصول جبر کو اختیار کیا' اس لئے ان حالات میں کسی بھی جنگ کو جہاد کے جزبہ سے نہیں لڑا جا سکتا ہے کیونکہ جذبہ جہاد جبر سے پیدا نہیں ہوتا ہے اور جبری بھرتی کے لوگوں کو مجاہدوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے زمانہ میں ہماری نوکر شاہی اور حکمرانوں نے جس طرح سے قانون و ضابطے بنا کر ایک فرد کی آزادی کو محدود کیا اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ برطانیہ میں آمرانہ حکومت کے لئے راستہ صاف ہو رہا ہے' ان مین سے کچھ ضابطے ہماری روایات کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھے' اور اسی لئے کہ وہ لوگ کہ جنہوں نے آزادی اور حریت کے لئے جدوجہد کی تھی وہ ان اقدامات سے سخت مایوس ہوئے۔ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کے اراکین کی ذمہ داری سب سے زیادہ تھی کہ جنہوں نے ان قوانین اور ضابطوں کو نافذ کیا اور اس ملک کو عملی طور پر ایک قید خانہ بنا دیا۔ اور اس کی وجہ سے شکست یا فوجی انقلاب کی صورت میں اہل برطانیہ کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ آزاد برطانیہ تحریک چلا سکتے۔

جبر کا استحکام

رتی کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اکثریت اب اس کو نہ
زمانہ امن میں بھی جاری رکھنا چاہتی ہے۔ برطانیہ میں اس
پہلے شروع ہو چکی تھی اور اس ملک کے لوگوں کا ایک حصہ
م سے بڑا متاثر تھا لہٰذا "قومی سروس" کی تحریک کی ابتدا
ڈ لوتھین نے ٹائمز کو ایک خط لکھا کہ ہر فرد کو جنگ یا امن
ت سپرد کرنی چاہئے۔ اب اس چیز کو تعلیمی طریقہ کہہ کر پھر

چ اور فکر ختم ہو جاتی ہے اور اس اصول سے انفرادی
ے مجروح ہوتا ہے۔ خصوصیت سے اہل برطانیہ نے اس
کے لئے طویل اور سخت جدوجہد کی ہے اور اس سے محض
ت بردار ہوا جائے یہ تاریخ کے ساتھ ظلم ہو گا۔ آزادی کا
پر سچائی کے ساتھ قائم رہے۔ اور فرد اپنے مقصد کے لئے
جب ایک فرد کو اس بات کی آزادی ہو تو ہم اسے ایک

ت کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات دینے کے لئے
ہ ریاست میں کچھ خامی ضرور ہے اور اس صورت میں اگر
ے لئے خود کو باقی رکھنا مشکل ہو جاتا ہے' ان حالات میں جبر
ی کر سکتی ہے۔ کسی بھی ریاست کی بقا کے لئے ضروری ہے
سے بڑھنے و پھیلنے کے مواقع فراہم کرے' صرف اسی ذریعہ

ہمیں اس بات کا اندازہ کر لینا چاہئے کہ جبر کے اصولوں کو اختیار کرنا آسان ہوتا ہے مگر ان سے چھٹکارا پانا بڑا مشکل ہے۔ ایک مرتبہ زمانہ امن میں جب جبری کے اصول کو نافذ کر دیا جاتا ہے۔ تو پھر یہ پھیل کر زندگی کے دوسرے شعبوں تک پہنچ جاتا ہے جن میں آزادی اظہار' و تحریر اور فکر شامل ہوتے ہیں۔ ہمیں احتیاط کے ساتھ اور بغور دیکھنا اور سوچنا چاہئے کہ ہم جو جبری بھرتی کے طریقے کو اختیار کر رہے ہیں یہ معاشرہ کو مطلق العنانیت کی طرف لے جائے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ان زنجیروں سے جنہوں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے' اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب ہمیں درد اور تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

جبر کے ذریعہ ترقی

بہت سے لوگ جو جبری خدمات کے قائل ہیں' ان کا خیال ہے کہ اس ذریعہ سے وہ اچھے نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ خیال اس نقطہ نظر کا ایک پہلو ہے کہ جس کے تحت یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ انسان کو نیک بنایا جا سکتا ہے۔ انہیں نہ صرف سیدھا راستہ دکھانے کی ضرورت ہے بلکہ انہیں اس راستہ پر چلنے پر بھی مجبور کیا جائے۔ اس نقطہ نظر کے حامی نہ صرف مصلح رہے ہیں بلکہ انقلابی بھی اور اس پر نسل بعد نسل عمل کیا جاتا رہا ہے' حالانکہ اس طرح سے یہ ناکام بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کی مثال موجودہ دور میں نازی اور فاشسٹ تحریکوں کی ہے۔

بہرحال ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے منفی اور مثبت اثرات کا تجزیہ کیا جائے۔ اس ذریعہ سے ایک تو ایسے تمام قوانین اور ضابطوں کو منسوخ کر دیا جاتا ہے کہ جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور خود غرض لوگوں کے عمل دخل کو بھی روک دیا جاتا ہے۔ اسے ضابطوں کا عمل کہا جا سکتا ہے کہ جس میں افراد کو ان کی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ جو ترقی احکامات کے ذریعہ کی جائے وہ آخر میں رد عمل کے نتیجہ میں پس ماندگی کی طرف لے جاتی ہے' جتنے اقدامات جلدی میں کئے جاتے ہیں اسی قدر ان میں قوت برداشت کم ہوتی ہے' ترقی کا مثبت طریقہ یہ ہے کہ لوگوں میں اصلاح کے جذبہ کو ابھارا جائے۔ وہی اصلاحات دیر پا ثابت ہوتی ہیں کہ جو اختلاف کے نتیجہ میں ابھرتی ہیں۔ اور جن کے لئے لوگوں کا ذہن تیار ہوتا ہے۔

طاقت کی خواہش

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "عظیم شخصیتیں" اور ان کے ارد گرد بننے والی کہانیاں ہوتی ہیں۔ عظیم شخصیت کا بت مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس کو جس چبوترہ پر کھڑا کیا گیا ہے اس سے ان لوگوں کی خواہشات کا اظہار ہوتا ہے کہ جو کسی بڑائی کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان میں خود بڑا اور عظیم بننے کی خواہش اور جذبہ نہیں ہوتا ہے۔ اب تک جس قدر بھی حکومت کے نظام ہیں' چاہے جمہوریت ہو یا آمرانہ حکومت' ان میں اقتدار انہیں کو ملتا ہے کہ جو طاقت و اختیارات کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک ایسے نظام حکومت کی ضرورت ہے کہ جو انسانوں سے طاقت کی خواہش اور جذبہ کو ختم کر سکے۔

ان حالات میں ہمیں ایک ایسی سیاسی تحریک کی ضرورت ہے کہ ووٹروں سے یہ وعدہ نہیں کرے کہ وہ اقتدار میں آکر ان کے لئے کام کریں گے۔ بلکہ یہ بتائیں کہ اگر وہ اقتدار میں آگئے تو کس طرح سے اور کن ذریعوں سے ان کے اختیارات کو روکا جائے گا۔ اور انہیں طاقت کے غلط استعمال کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

وہ لوگ کہ جو اس نظام میں اقتدار میں آئے ہیں۔ ان کے لئے یہ آسان ہے کہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے وہ لوگوں کے جذبات کو ابھاریں۔ اور ہوش مندی اور عقلیت سے انہیں دور رکھیں۔ ان کے حقوق کی بجائے ان کی دلچسپیوں کی بات کریں' اصولوں کی بجائے مصلحتوں کے بارے میں تقریریں کریں۔ عملی طور پر ایک کامیاب طریقہ ہے'

اگر اعلیٰ اصولوں کی بات کی جائے تو اس سے لوگوں میں شک و شبہ اور بد اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ عملی طور پر سب سے مشکل کام یہ ہے کہ مصلحت کو دریافت کیا جائے۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک مصلحت کے بعد دوسری مصلحت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انسان ایک ایسے چکر میں پھنس جاتا ہے کہ جس سے اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مصلحتوں کے

اس تعاقب میں اچھی خواہشات اپنی جگہ، مگر اس سے ایسا خطرناک الجھاؤ پیدا ہوا کہ جس نے 1914ء اور 1939ء کی جنگوں کو شروع کرایا۔

مصلحت اور تنگ نظری

ہم تاریخ سے یہ بھی سیکھتے ہیں کہ مصلحت بہت کم مفید ثابت ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود آج سیاستدانوں کی اکثریت مصلحت کی زبان بولتی ہے۔ شاید ان میں سے اکثر اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ انہیں کہیں ست یا کاہل نہ سمجھ لیا جائے۔ اس لئے وہ حقیقت پسندانہ رویہ کی بات کرتے ہیں' مگر ان کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ سیاست میں حقیقتوں کو دیکھنے کی بجائے وہ مصلحتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کو مضحکہ خیز بنا لیتے ہیں کہ جو ایک طرف تو وطن کے لئے قربانیوں کی بات کرتے ہیں' اور روحانی درجات حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ کسی عالمی صورت حال اور عالمی امور کا مسئلہ آتا ہے تو یہ خود غرضانہ پالیسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کو ایک ایسے ملک کے لئے قربانی دینے کا کیا فائدہ کہ جس کی روحانی ترقی کے راستوں کو اس طرح سے بند کر دیا جائے۔ اور جس ملک کے مثالی بننے کی جدوجہد کو ختم کر دیا جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی چھلکے کو محفوظ رکھے اور شکل کو بچائے رکھے مگر اس کی روح کو تباہ کر دے۔ کسی معاشرہ کی یہ تباہی اسی وقت آتی ہے کہ جب اس میں گمراہ کرنے والی وطن پرستی ہو۔ اسی کے تحت وہ ایک کے بعد ایک حماقت سے وہ چار ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہوتی ہے جو نظریات ملک کی داخلی پالیسی میں اختیار کئے جائیں۔ انہیں کو خارجہ امور میں بھی ملحوظ رکھا جائے۔ کیونکہ جو سچائی اندرونی معاملات میں ضروری ہے۔ اس کی ضرورت خارجی امور میں بھی لازمی ہوتی ہے۔ اگر بات اس کے برعکس ہو تو ملک کا احترام خود لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔

وعدہ کی اہمیت اور وعدہ پورا کرنا

تہذیب کی تشکیل کی بنیاد وعدوں کے پورا کرنے پر ہوتی ہے۔ اگر وعدہ کی پابندی اور اس کو پورا کرنے کا اعتماد ٹوٹ جائے تو ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر مسمار ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کی تمام کوششیں' اور تمام انسانی تعلقات چاہے وہ ذاتی ہوں' سیاسی یا تجارتی ان کا دارومدار وعدوں کے پورا ہونے میں ہوتا ہے۔

یورپ جن دنوں جنگ کی صورتحال سے دو چار ہوا۔ اس میں ہم اس صورت حال کا بہترین تجزیہ کر سکتے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے کچھ سال پہلے جنگ کے حامیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اقوام یورپ کے درمیان ہونے والے معاہدوں کی سختی سے پابندی کرنی چاہئے۔ حالانکہ انہیں پورا احساس تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں معاہدوں کی شرائط کو پورا کرنا ممکن نہیں' اس طرح کچھ سیاستدانوں نے یہ دلیل دی کہ حملہ آوروں کو کھلی چھٹی دے دینی چاہئے جب تک ان کا حملہ ہم پر نہ ہو' اور وہ ہمیں تنہا چھوڑے رکھیں۔ تاریخ ہمیں بار بار یہ سکھاتی ہے کہ اس انداز سے جو حفاظت حاصل کی جاتی ہے بالاخر ایک دھوکہ اور فریب ثابت ہوتی ہے۔

اخلاقی طور پر یہ انتہائی غیر مناسب بات ہے کہ ایسے وعدے کئے جائیں کہ جو پورے نہ کئے جا سکتے ہوں۔ اس لئے ایسے وعدے نہیں کرنے چاہیں کہ جن سے لوگوں میں جھوٹی امیدیں پیدا ہو جائیں۔ میرے سامنے اس سلسلہ میں پولینڈ کی مثال ہے کہ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ کہ برطانیہ اور فرانس فوجی لحاظ سے اس قابل نہیں کہ اس کی حفاظت کر سکیں۔ اور اسے شکست سے بچا سکیں۔ تو یقیناً وہ جرمنوں کی اس قدر سخت مخالفت نہ کرتے اور ان کے یہ مطالبات مان لیتے کہ ڈان زگ انہیں دے دیا جائے۔ اور ان کی فوجوں کو گزرنے کا راستہ' کیونکہ جنگ کی صورت میں یقینی تھا کہ انہیں شکست ہو گی اور وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اس سے بری طرح متاثر ہوں گے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قسم کے وعدے جنگ کو پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ حفاظت کا یقین دلایا جاتا ہے۔ خاص طور سے بحرانی زمانہ میں ایک ایسے ملک اور علاقے کے لئے جہاں جنگ کے خطرات ہوں' اور وہ بھی جرمنوں کے خلاف کہ جو جنگ چاہتے تھے۔ برطانیہ کی پولینڈ کی حفاظت کی گارنٹی بہت کمزور تھی۔ اس ضمانت کی وجہ سے پولینڈ کے لوگوں میں مزاحمت کا جذبہ سخت ہو گیا اور انہوں نے کسی بھی معاہدوں سے انکار کر دیا۔

برطانیہ کے وزیراعظم گلیڈاسٹون نے جو اصول وضع کئے تھے ان میں اہم بات یہ تھی کہ کسی بھی مسئلہ پر کم سے کم وعدے کئے جائیں۔ کمزور کو مدد کر کے اس قدر نہیں ابھارا جائے کہ وہ اپنے سے طاقت ور سے لڑنے لگے۔ اس کے بمقابلہ میں طاقت ور کو سختی اور معتدل بیانات کے ذریعہ کمزوریوں پر حملہ سے روکا جائے۔

جنگ کی ابتداء

جس وقت جنگ کا ماحول ہو تو ضروری ہے کہ اس وقت جذبات پر قابو پایا جائے مثلاً دوسری جنگ عظیم کے دوران جب ہٹلر کی فوجیں یورپ میں پیش قدمی کر رہی تھیں اس وقت برطانیہ میں میکس ٹن نے کہا تھا کہ اگرچہ قوم کا موڈ جھنجلاہٹ کا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم محض جھنجلاہٹ کی وجہ سے جنگ کا اعلان نہ کریں۔

لیکن ساتھ ہی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو حالات کو بگاڑتے ہیں۔ مثلاً جنگ دوم کی ابتدا میں دار الامراء میں تقریر کرتے ہوئے ایک رکن نے کہا کہ "مسٹر چمبرلن خون ریزی سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ میں خود تو کل ہی جنگ شروع کر دوں۔" اس نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ برطانیہ 1914ء کے مقابلہ میں جنگ کے لئے زیادہ تیار ہے۔ حالانکہ اس کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ اور وہ یقینی طور پر اس پوزیشن میں تھا کہ جہاں سے اسے صحیح صورت حال کا علم تھا۔ جب مستقبل کا مورخ جنگ کی وجوہات لکھے گا تو اس میں یقیناً اس قسم کے بھڑکانے والے بیانات کو بھی شامل کرے گا۔

جنگ کے جراثیم

اگر ملکوں کی پالیسی میں اس قسم کی کمزوریاں ہوں تو وہ جنگ کا سبب بن جاتی ہیں۔ ہمدردی' نفرت' مفاد' اور وفاداری انسان کے فیصلوں کو متاثر کرتی ہے' اور اس قسم کی تنگ نظری سے ذہن اور رویہ میں توازن نہیں رہتا۔ وہ کون سا عمل ہوتا ہے کہ جو جنگ کو پیدا کرتا ہے۔ اس مطالعہ کے لئے 1914 سے پہلے کی 50 سالہ تاریخ کو اگر پڑھا جائے تو اس عمل کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لئے ان دستاویزات کو پڑھنے کی ضرورت نہیں کہ جو حکمرانوں' وزیروں' اور جنرلوں نے ترتیب دی ہیں۔ بلکہ ان نوٹس کو پڑھنا چاہئے کہ جو مورخوں نے حاشیوں پر لکھے ہیں یا وہ کچھ باتیں جو زبانی سینہ بہ سینہ پہنچتی ہیں۔ ان سے ان کی ذاتی نفرت' اور سچائی کے سلسلہ میں ان کی لاتعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ وہ کمزوریاں ہیں کہ جن کی وجہ سے خطرناک قسم کی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ صداقت ایک بنیادی خوبی ہے۔ اور یہ سوچ اور فکر کی بنیاد ہے کہ جو ترقی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ اکثر ناکامیوں کے پس منظر میں انتہا پسندی کو دخل ہوتا ہے۔ اعتدال کا راستہ ہمیشہ محفوظ راستہ ہوتا ہے اس صورت حال کو دیکھنے کے لئے کہ کن بیانات سے' تحریری ہوں یا زبانی' کوئی بحران شروع ہوا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان بیانات کی صداقت کو پرکھا جائے اور ان بیانات سے جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ بھی اس وقت دور ہو سکتی ہیں کہ جب بیان کا سچائی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے۔ بغیر سوچے سمجھے فیصلے دے دینا۔ افواہوں کو پھیلانا' مبالغہ' آمیز بیانات دینا۔ یہ وہ کمزوریاں ہیں کہ جو جنگ کے جذبات کو پھیلاتی ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے جراثیم ہمارے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ اور ان کا تعلق معاشیات' سیاسیات' اور مذہب سے اس قدر

نہیں ہوتا۔ ہم کس طرح سے یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہم دنیا سے بغیر خود کا علاج کرائے ہوئے۔ اور خود کی اصلاح کئے بغیر جنگ کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جنگ کی بنیادی وجوہات خود ہمارے اندر ہوتی ہیں۔

جراثیم کیسے پھیلتے ہیں

جنگ کے یہ جراثیم ان لوگوں میں بہت باعمل ہوتے ہیں کہ جو ملک و قوم کے معاملات پر اختیارات رکھتے ہیں۔ اختیارات کے جس ماحول میں وہ گھرے ہوتے ہیں۔ اور طاقت و اقتدار کے حصول میں جس قدر مصروف ہوتے ہیں۔ اسی قدر ان میں اس کے استعمال کا جذبہ بڑھتا رہتا ہے۔ اگرچہ معاشی وجوہات کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ مگر گہرا اور فیصلہ کن عنصر انسانی فطرت میں ہوتا ہے' کہ جس میں قبضہ و حصول کی خواہش' مقابلہ کرنے کا جذبہ' غرور و فخر' اور جنگ جو یا نہ جذبات ہوتے ہیں۔ اور یہ انسان میں اس وقت نشونما پاتے ہیں کہ جب اس کا تعلق بے ایمانی اور دھوکہ سے ہو اور وہ صداقت سے بیزار ہو۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے 25 سال کے حالات میں ہم جرمنی کے قیصر میں جو اہم خصوصیت دیکھتے ہیں وہ اس کا فخر و غرور تھے۔ اور اس میں اس برطانیہ سے جلن و حسد اور محبت بھی شامل تھی۔ اس کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہی کہ جنگ کے سلسلہ میں اس کا انگلینڈ سے کیا رویہ ہو سکتا تھا

پہلی جنگ عظیم سے پہلے ہم آسٹریا اور روس کی حکومتوں کے رویہ اور خصوصیت سے ان کے امور خارجہ وزیروں کے بیانات کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہو گا کہ کس طرح انہوں نے بجائے اس کے ذاتی بے عزتی کو برداشت کر لیتے' اس کی خاطر ہزارہا لوگوں کو قربان کر دیا۔ اور کس طرح آسٹریا کی حکومت جرمنی کے قیصر کے بھڑکانے پر جنگ میں اس قدر آگے بڑھ گئی کہ اس کا رکنا ناممکن ہو گیا۔ عقل اور ہوش مندی کی بجائے اس نے جذبات پر زیادہ بھروسہ کیا۔ جب آسٹریا نے جلد بازی میں جنگ کا اعلان کر دیا تو جرمنی کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا کیونکہ دوسری صورت میں اس پر کمزوری کا الزام لگتا' آسٹریا نے دوسری جانب یہ سوچا کہ اگر اس نے جنگ میں سستی دکھائی تو اسے جرمنی سے جس امداد کی توقع ہے وہ نہیں ملے گی۔ لہٰذا ان حالات میں ایک ایسی جنگ کی ابتداء ہوئی کہ جس نے وسیع پیمانہ پر

قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو فوج نے فوجی وجوہات کی بنیاد پر تمام اختیارات سنبھال لئے' جرمن فوج جو کہ آسٹریا کی فوج کو بھڑکا رہی تھی' روس کے جنگ میں آنے کے بعد جنگ کے لئے اور زیادہ تیار ہو گئی اور یہ دلیل دی کہ فوجی صورت حال پہلے کہ مقابلہ میں ان کے حق میں اب زیادہ ہے' انہوں نے قیصر سے روس کے خلاف اعلان جنگ کرا دیا۔ اس نتیجہ میں وہ فرانس سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے۔ محض اس لئے نہیں کہ فرانس روس کا حلیف تھا۔ بلکہ اس لئے کہ جرمنی کا جنگی منصوبہ اس قسم کا تھا کہ دونوں طاقتوں سے بیک وقت جنگ کی جائے' یہ منصوبہ اس قدر پکا اور نہ تبدیل ہونے والا تھا کہ اس کو وہ تبدیل کرکے منصوبہ کے عمل کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے قیصر اور چانسلر کے احتجاج کے باوجود روس اور فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ جرمن منصوبں کے تحت وہ فرانس کے سرحدی قلعوں کو مسمار کرنا چاہتے تھے اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ وہ بلجیم سے نہ گزریں۔ بلجیم کی غیر جانبداری کو جب توڑا گیا تو اس کے ضامن کے طور پر برطانیہ کو بھی جنگ میں الجھنا پڑا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر فوج کو جنگ کی منصوبہ بندی کے تمام اختیارات دے دئے جائیں تو وہ کس طرح سیاسی' معاشی اور اخلاقی وجوہات کو نظر انداز کر کے اور دوسری تمام الجھنوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے فوجی منصوبہ پر عمل کرنے پر زور دیتے ہیں اس لئے جب جرمن منصوبہ کا بنیادی پلان ناکام ہوا تو وہ ایسی مشکلات میں پھنسے کہ ان کا نکلنا مشکل ہو گیا۔

اس قسم کے دوسرے حالات کی وجہ سے جنگ کا خاتمہ مشکل ہو گیا۔ 1917ء میں جرمنی میں وہ پارٹی کہ جو امن کی حامی تھی اس کا قیصر پر اثر بڑھ گیا تھا اور وہ اس پر تیار تھے کہ تمام مفتوحہ علاقوں سے جرمن فوجوں کو واپس بلا لیں بلکہ یہاں تک کہ السس لورین کا ایک حصہ بھی فرانس کو دے دیں۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی یہ کوششیں اس وجہ سے ناکام ہوئیں کہ برطانوی حکومت تک ان منصوبوں کو پہنچایا ہی نہیں گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر ربوٹ کو اس پر اعتراض تھا کہ یہ بات مسٹر برائنڈ کی معرفت کیوں کہلائی گئی' یعنی اس کی وجہ فرانسیسی وزیر خارجہ اور فرانسیسی وزارت خارجہ کے درمیان تعلقات کی

کشیدگی تھی اور جب تک حقائق معلوم ہوئے ان کی وجہ سے مسٹر روٹ کا تو زوال ہوا۔ مگر اس وقت تک قیصر پر جنگ جو پارٹی کا غلبہ ہو چکا تھا۔

اس طرح سے جب آسٹریا کے بادشاہ نے جرمنی سے اپنے تعلقات توڑنا چاہئے اور امن کا خواہش مند ہوا تو اس کی خواہشات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی' اور اس طرح امن کا ایک شاندار موقع کھو دیا گیا۔ اس کے پس منظر میں اٹلی کے وزیر خارجہ اور فرانس کے وزیراعظم کی مخالفت تھی کہ جس کی وجہ سے انہوں نے اس کو برطانوی اور امریکی حکومتوں سے چھپائے رکھا۔ اور خفیہ طور پر اس کی اطلاع جرمنی کی دے دی۔

جنرل ہوف مین نے بااثر لوگوں کے سیاسی گٹھ جوڑ اور سازشوں پر خوب لکھا ہے۔

"جب کسی کو بااثر لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے' اور وہ ان کے ایک دوسرے سے خلاف تعلقات کو دیکھتا ہے۔ ان کی متضاد خواہشات سے واقف ہوتا ہے اور ان کی نفرتوں اور ایک دوسرے کے خلاف عداوتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو اس کو یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ دوسری جانب فرانسیسیوں' انگریزوں' اور روسیوں میں بھی ایسی ہی خراب ترین صورت حال ہو گی۔ اقتدار کی جنگ اور ذاتی مفادات کو پورا کرنے کی خواہشات انسان کے کردار کو مسخ کر دیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف وہ انسان اپنے وقار اور عزت کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ جو اپنی جاگیر میں رہتا ہے کیونکہ وہاں اسے کسی سازش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک اچھے موسم کی خواہش کرنے کے لئے کسی سازش کی ضرورت نہیں"

جنگ کی تاریخ کو اگر فوجی حربوں اور سیاسی عمل کے ذریعہ دیکھا جائے تو حقیقت میں وہ سطحی ہوتی ہے۔ اس میں افراد کے ذاتی خیالات اور ذاتی عمل گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہوف مین نے کہا ہے۔ "زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے تاریخ کی تشکیل کو بہت قریب سے دیکھا ہے' اور اب مجھے اس کا پتہ چلا ہے کہ اس کا حقیقی عمل اس سے بالکل مختلف ہے جو کہ اب تک ہم آنے والی نسلوں کو بتاتے رہے ہیں۔"

جنگ کے بعد

تاریخ سے ہم یہ سیکھتے ہیں کہ جنگ ایک اور جنگ کو پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ جنگ کا ماحول مخالفانہ جذبات کی تمام اقسام کو ابھارتا ہے۔ اور ان کو جنگ کے بعد سازگار ماحول ملتا ہے۔ خاص طور سے ایک طویل تھکا دینے والی جنگ ان جذبات کو ابھارنے میں مددگار ہوتی ہے' اور خصوصیت سے اگر اس جنگ میں کسی ایک حریف کو مکمل طور پر فتح ہو جائے تو اس صورت میں شکست خوردہ اپنی تمام مصیبتوں اور مشکلوں کے لئے فاتح کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور اپنی حماقتوں اور غلطیوں کی بجائے شکست کو ساری مشکلات کا سبب گردنتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ فتح مند ہو جاتے تو وہ تمام برے اثرات سے بچ جاتے۔

ان تمام نتائج اور حالات کا مشاہدہ پوری طرح سے 1914ء اور 1918ء کی جنگ کے بعد کے حالات کے تجزیہ سے ہو سکتا ہے' کیونکہ یہ وہ جنگ تھی جو سب سے زیادہ تلخ اور سب سے زیادہ تھکا دینے والی تھی' اور اس جنگ کی خصوصیت بھی تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ لوگوں کی اکثریت نے شمولیت کی تھی۔ اور پھر ان ملکوں میں کہ جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا ان لوگوں کی حکومت تھی جو دہشت اور جنگ چاہتے تھے' اور یہ لوگوں کی توجہ ان کے بنیادی مسائل سے ہٹا کر جنگ کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ خصوصیت سے جرمنی میں کہ جس کے بہت سارے مسائل تھے۔ اور جو کہ نہ صرف شکست خوردہ تھے بلکہ جو ذہنی طور پر فوجی عزائم رکھتے تھے۔

فتح کا فریب

تاریخ سے یہ بھی سیکھتے ہیں کہ مکمل فتح فاتحین کی خواہشات کے مطابق ہمیشہ کے لئے امن نہیں لے کر آتی بلکہ یہ امن بجائے ایک نئی جنگ کو پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ فتح کی وجہ سے شکست خوردہ لوگوں میں انتقام اور بدلہ لینے کے جذبات شدت سے پیدا ہوتے ہیں اس صورت میں اگر فتح کسی اتحاد کے نتیجہ میں ہو تو یہ ہمیشہ نئے رقیبوں کو پیدا کرتی ہے۔ اس کی تصدیق ہماری تاریخ سے بخوبی ہوتی ہے۔ مثلاً سترہویں صدی میں ہم نے ہالینڈ کی مدد سے اسپین کو شکست دی' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ہالینڈ کے ساتھ تین جنگیں لڑیں' اور بالاخر فرانس کی مدد سے اس کی طاقت کو ختم کیا۔ اور پھر جلد ہی فرانس کی ابھرتی ہوئی طاقت کے خلاف ہم نے کئی نئے اتحاد بنا دیئے' اور چھ جنگوں کے بعد جو کہ پوری ایک صدی تک جاری رہیں' ہم نے فرانس کی قوت کو توڑ دیا۔ لیکن فوراً ہی ہمارے اتحادی' روس اور پروشیا' ہمارے سب سے زیادہ خطرناک دشمن بن گئے' اور ہمارے اتحادیوں میں فرانس شامل ہوگیا کہ جسے ہم نے بڑی طرح سے شکست دی تھی۔

اس لئے کریمیا کی جنگ میں برطانیہ نے فرانس کی مدد سے روس کو ختم کرنا چاہا' اور 5 سال بعد ہی برطانیہ کو ایک بار فرانس سے خطرہ ہوگیا۔ یہ خطرہ وقتی طور پر اس وقت ٹل گیا جب کہ 1971 میں جرمنی نے فرانس کو شکست دی' انیسویں صدی کی آخری دہائی میں برطانیہ ایک بار پھر روس اور فرانس سے جنگ کے لئے تیار تھا۔ اور ان کی مخالفت میں اس نے جرمنی سے معاہدہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر جاپان سے اتحاد قائم کیا تاکہ روس کو مشرق بعید میں روک سکے' اس کی وجہ سے جاپانیوں کو اس کا موقع ملا کہ وہ روس کی توسیع پسندی کی مخالفت کر سکیں۔ اور جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست کی وجہ سے فرانسیسی و روسی اتحاد کمزور ہوا اور وہ جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہیں روک سکے۔ اور اسی صورت حال نے برطانیہ کو فرانس کا حلیف بنا دیا۔

یورپ میں 1914ء اور 1939ء کی جنگوں میں اتحادی اور حلیف بدلتے رہے اور جنگ کے خطرات ٹالنے کے بجائے جنگ کے شعلوں میں الجھتے رہے۔

فتح کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی ملک یا لوگ جنگ کے بعد ایسی امن کی صورت حال سے دو چار ہوں کہ جو جنگ سے پہلے نہ تھی۔ اس قسم کی فتح اس وقت ممکن ہے کہ جب اس کے نتائج سے فوری طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خاتمہ کو اپنے وسائل کے مطابق سے فوری پورا کیا جائے۔ یہ عقل مندی ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے جنگ کی جائے۔ مگر یہ ایک غلطی ہو گی کہ فتح کے لئے اپنے تمام ذرائع کو استعمال کر کے خود کو تھکا دیا جائے۔ تاریخ کا تجزیہ سکھاتا ہے کہ وہ قومیں جو جنگ سے پہلی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گفت و شنید کر کے معاہدہ کر لیتی ہیں وہ مناسب شرائط کو حاصل کرکے کوشش کرتی ہیں کہ ایک ایسی جنگ سے گریز کریں کہ جس کا مقصد صرف فتح ہو۔

یہ ایک زبردست غلطی ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ طاقتور جارح کو پرامن طریقہ سے روکا جا سکتا ہے۔ اگر اسے حملہ نہ کرنے کی رشوت دی گئی۔ تو پھر وہ مزید اور رشوت طلب کرے گا۔ اس لئے اسے صرف طاقت کے ذریعہ ہی روکا جا سکتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اس قسم کے شواہد سامنے لاتا ہے کہ کسی مہذب ریاست کے زوال کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ اس پر دشمن کا براہ راست حملہ ہو اور حملہ اس کو تباہ او برباد کر دے' اس کے زوال کی وجہ اندرونی ہوتی ہے کہ جس میں جنگ کے نتیجہ میں اس پر تھکاوٹ طاری ہو جاتی ہے اور یہی خستگی اسے کمزور کر دیتی ہے۔

جنگ کو روکنا

تاریخ سے یہ سیکھا جاتا ہے کہ ایک طویل جنگ کے بعد اس کے بچنے والے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جنگ میں کوئی بھی فاتح نہیں تھا' بلکہ دونوں ہی ہارنے والے تھے۔ یہ حقیقت 500 ق۔ م میں چینی کلاسک سنزو کے اندر بھی ملتی ہے۔

جنگ صرف اس صورت میں فائدہ مند ہوتی ہے کہ جو اس کے نتائج سے فوری طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ اور صرف ایک جارح یہ امید کر سکتا ہے کہ وہ فوری فتح سے فائدہ اٹھائے گا۔ اگر جنگ میں فوجی نتائج نہ نکلیں تو پھر باہمی جنگ طویل ہو جاتی ہے۔ اور یہ جنگ کی تمام طاقتوں کو تباہ کر دیتی ہے' یہاں تک کہ یہ باہمی گفت و شنید کے ذریعہ ختم کی جائے۔

کیونکہ جارح جنگ اس لئے شروع کرتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے' اس لئے وہ پر امن تصفیہ کے لئے تیار ہوتا ہے جب کہ جس پر حملہ کیا گیا ہو وہ انتقام کی خاطر اس وقت تک جنگ کرتا ہے کہ جب تک اسے فتح نہ ہو جائے' حالانکہ تجربات اس بات کے گواہ ہیں کہ طویل جنگ کے بعد فتح ایک سراب ثابت ہوتی ہے۔ انتقام کی خواہش فطری ہوتی ہے۔ لیکن اس کے دور رس نکلتے ہیں کہ جو نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اگر انتقام لے لیا جائے تو پھر ایک چکر شروع ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد دوسرا اس انتقام کی خواہش کرتا ہے۔ اس لئے ایک سمجھدار سیاستدان ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ طویل جنگ کے بجائے فوری طور پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔

وہ ملک کہ جس پر حملہ کیا گیا ہو اور جو حملہ کے نتیجہ میں نقصانات سے دوچار ہوا ہو' جب امن اور معاہدہ کی بات ہو تو اس کی شرائط کو زیادہ سے زیادہ تسلیم کرنا چاہئے تاکہ اس کے نقصانات اور انتقام کے جذبات کو اس طرح سے ٹھنڈا کیا جائے۔

یہ دھوکہ کہ موجودہ دشمن مختلف ہے

تاریخ میں لوگ بار بار اس فریب کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کا موجودہ دشمن ماضی کے دشمنوں کے مقابلہ میں مختلف ہے، اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے دشمنوں سے زیادہ ظالم اور بدمعاش ہے۔ مثلاً اہل برطانیہ کے لئے یہ دشمن سولہویں اور سترہویں صدی میں اسپین تھا۔ اٹھارویں صدی میں یہ فرانس کا کوئی چہاردہم تھا، اور اس صدی کے آخر میں یہ بد ترین دشمن فرانسیسی انقلاب بن گیا، جب ابتدائی انیسویں صدی میں نپولین کے سر اس کا یہ سہرا بندھا۔

خاص بات یہ ہے کہ نہ صرف احساسات بلکہ زبان تک ایک ہوا کرتی ہے۔ مجھے مشہور مورخ اسٹب کا ایک مشہور جملہ یاد آ رہا ہے کہ جو اس نے اس وقت کہا تھا کہ جب برطانیہ پر نپولین سوم کے حملہ کا خطرہ تھا، جب اس سے پوچھا گیا کہ جرمن اور اہل برطانیہ کیوں تاریخ میں ہمیشہ پرامن اقوام رہی ہیں۔ (جو کہ درحقیقت ایک انتہائی غیر تاریخی بیان ہے) تو اسٹب نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ فرانس کا جو رویہ آج ہے۔ وہ پچھلے ہزار سال کی تاریخ میں بھی رہا ہے یعنی جارح، غیر دانشمندی اور دھوکہ دینے والا۔"

معاہدوں کا فریب

تاریخ کا ایک سبق یہ ہے کہ حکومت کے درمیان ہونے والے معاہدوں میں کوئی استحکام نہیں ہوتا' سوائے اس کے جب تک یہ حکومتیں ان معاہدوں کو اپنے مفاد کے لئے ضروری خیال کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم ان کھوکھلے جملوں پر یقین نہیں کرے گا کہ جن میں معاہدوں کو "مقدس" کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے عالمی امور اخلاقی اصولوں پر نہیں بلکہ مفادات پر ہوتے ہیں۔ معاہدوں کی حقیقت کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا وجود دو یا دو سے زیادہ طاقتوں کی ضرورت اور سہولتوں پر ہوتا ہے' اگر ان میں دونوں کا باہمی مفاد ہے تو یہی کسی معاہدے کی ضمانت ہوتی ہے۔ کمزور طاقت کی جانب سے اگر بات چیت ہو تو اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ دو طاقتوں کا متوازن قوت رکھنا معاہدہ کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

جنگ کے موضوع پر تاریخ جو کچھ ہمیں سکھاتی ہے۔ اس میں ایک بنیادی غلطی جو ہوتی رہی ہے وہ یہ کہ امن سے پہلے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ مخالف راہنما کو اقتدار سے علیحدہ کیا جائے جیسا کہ پہلی جنگ عظیم میں ہوا کہ جب قیصر کی برطرفی کو امن پر ترجیح دی گئی۔ اس طرح سے وہ فوجی پارٹی کہ جو جنگ کی ذمہ دار تھی وہ صاف بچ نکلی اور جس جماعت نے صلح کی بات چیت کی تھی اس پر شکست کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ کیونکہ اگر مخالف راہنماؤں کو امن سے پہلے اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ کرنے کی تمام ذمہ داریوں سے بری الزمہ ہو جاتے ہیں۔

ان کے اس فرار کی سزا آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔ مثلاً ہٹلر کے اقتدار سے ہٹ جانے کی صورت میں اس کے لئے خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی اور وہ خود ایک روایت بن گیا جو کہ مہذب دنیا کے لئے بڑے خطرہ کا باعث ہے اس طرح سے ہٹلر نپولین سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اس نے اس زیادہ سماجی اصلاحات کیں تھیں اس

لئے اس کی شخصیت عوام کے لئے زیادہ جاذب ہو سکتی تھی۔ اگر جنگ کے بعد کے حالات ذرا بھی خراب ہوتے تو ہٹلر کی شخصیت دوبارہ سے نجات دہندہ کی شکل میں ابھر کر آتی۔

اس کے مقابلے میں وہ راہنما کہ جنہوں نے جنگ شروع کی تھی جب وہ امن کے لئے مجبور ہوئے تو انہیں لوگوں کی جانب سے سخت مخالفت اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے اپنی تمام مشکلات اور مصیبتوں کا باعث انہیں قرار دیا۔ اس کے نتیجہ میں انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اقتدار کو چھوڑ دیں اور پھر لوگوں پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ آئندہ جنگ کی حمایت نہیں کرتے۔

جذبات کے ساتھ کوئی بھی سوچ ممکن نہیں' اسی طرح جیسے کہ دھند میں صاف نہیں دیکھا جا سکتا' اس لئے جذبات کو ہمیشہ علیحدہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہ لوگ کہ جو امن کے زبردست حامی ہوتے ہیں وہی لوگ جذبات کے نتیجہ میں جنگ چاہنے لگتے ہیں۔ اور خواہش کرنے لگتے ہیں کہ ہر قیمت پر دشمن کو اقتدار سے محروم کیا جائے۔

دانشور کا تذبذب

بائیں بازو کے دانشور پر امن تحریک میں اہم کردار ادا کرتے ہیں' مگر یہ لوگ امن کی جدوجہد میں فوجی حقیقتوں پر بہت کم توجہ دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی ترک اسلحہ کی پالیسی کی وجہ سے جنگ بند کرنے کی تیاریاں رک جاتی ہیں یا کم ہو جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جنگ دوم میں کیوں ان میں سے اکثر بعد میں جنگ کے سخت حامی ہو گئے۔

ایک دانشور کو احساس کرنا چاہئے یہ دنیا جذبات کی بنیاد پر تشکیل پذیر ہوئی ہے۔ جذبات کہ جو عقل سے بھی کنٹرول نہیں ہوتے۔ اگر وہ اس چیز کا احساس نہیں کرتا تو سوچ اور مشاہدہ سطحی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ عقل کی بنیاد پر سوچنا شروع کر دیتا ہے تو پھر وہ جذبات کی رو میں بہتا نہیں ہے۔ پچھلی دہائیوں میں بائیں بازو کے دانشوروں نے جو غلطیاں کی ہیں۔ ان میں سے بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے جذبات اور دلیل سے افکار کی اہمیت کو پورے طریقے سے نہیں سمجھا۔ ان میں سے اکثر دانشوروں نے خود اندرونی اور بیرونی معاملات میں دلیل کا استعمال نہیں کیا' اور نہ ہی اپنے جذبات پر قابو پایا' اس طرح سے انہوں نے برطانیہ کو مشکلات میں دھکیل کر جنگ پر مجبور کیا۔ جارج اور ویل نے اس موضوع پر بڑی گہرائی کے ساتھ تنقید کی ہے ان کے مطابق "وہ توانائی کہ جو دنیا کی تشکیل کرتی ہے وہ جذبات سے ابھرتی ہے۔" اس سے اس کا مطلب نسلی فخر' لیڈروں کا احترام' مذہبی عقائد اور جنگ سے محبت ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ طاقت ور جذبات ہوتے ہیں۔ دانشور کی توانائی بھی سچائی کی محبت سے ابھرتی ہے اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کا تجربہ اور لوگوں کے سمجھنے کی قوت بڑھے۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے جذبات نے تاریخ کو بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ ایک سوچنے والے آدمی میں اس وقت توانائی کے سوتے سوکھ جاتے ہیں کہ جب اس کا فکر کی راہنمائی پر سے عقیدہ اٹھ جاتا ہے اور وہ خود کو وقتی طور پر پھیلے ہوئے جذبات میں بہنے دیتا ہے۔

طاقت کا مسئلہ

جس قدر میں تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں اسی قدر میرا یقین اس پر پختہ ہوتا جاتا ہے کہ کسی بھی مسئلہ کو طاقت کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا ہے' اور اگر اس قسم کی کوئی مثالیں ہیں کہ جن میں طاقت کے ذریعہ مشکلات پر قابو پایا گیا ہے تو اس پر بلاشبہ شک کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا ہم یہ خطرہ برداشت کرتے ہوئے کہ اب تک جو کچھ عقل و دلیل کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے اسے کھو دیں' اور اس کے ساتھ ہی طاقت وہ قوت کی دہشت کو اس دنیا سے ختم کر دیں؟ اور پھر یہ سوال بھی ہے کہ کیا ہم اس قابل ہیں کہ اسے ختم کر سکیں صرف ایک حل اس کا نظر آتا ہے وہ یہ کہ طاقت ان لوگوں کے پاس آ جائے کہ جو طاقت کے استعمال پر تیار نہ ہوں۔ یہ حل جارج برنارڈشا کے پیش کردہ حل کے مطابق ہے کہ جو اس نے میجر باربرا میں پیش کیا تھا کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ بارود بنانے والے یونانی زبان کے پروفیسر نہ بن جائیں' اور میرا خیال ہے کہ یہاں اس کے ذہن میں گلبرٹ مرے تھے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یونانی زبان کے پروفیسر بارود بنانے لگیں اور اس کے ساتھ ہی ہم افلاطون کے اخذ کردہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی امور و معاملات اس وقت تک بہتر نہ ہوں گے جب تک حکمراں فلسفی نہ ہو جائیں یا فلسفی حکمراں نہ بن جائیں۔ اگر مسلح فوجوں پر ان لوگوں کا کنٹرول ہو کہ جو اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ طاقت کے استعمال سے تباہی و بربادی آتی ہے تو صرف اس صورت میں اس برائی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہی لوگ اس کا استعمال اس وقت بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں کہ جب تہذیب کے دشمن انہیں اس کے استعمال پر مجبور کریں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1914' 1918 میں جو سیاسی راہنما طاقت کی خرابیوں سے باشعور ہو گئے تھے' انہوں نے اس کا اظہار بعد میں کیا اور یہ وقت تھا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا' اور حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو چکے تھے۔

طاقت کو محدود کرنے کا مسئلہ

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بین الاقوامی تحفظ یا ترک اسلحہ کے کسی منصوبہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ ان کے لئے بہت سارے ماہرین کی تجاویز اور آراء کو ہم آہنگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مسلسل کانفرنسیں منعقد کی جاتی رہتی ہیں یہاں تک کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے کے امکانات کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور سیاسی تحریک میں تھکاوٹ آ جاتی ہے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں' کیونکہ جنگ کے محکمہ کا یہ کام نہیں کہ جنگ کے بارے میں مطالعہ کرے' اس کا کام ہے کہ جنگ کے ہتھیار و آلات کو تیار کرے۔ اس لئے وہ تمام لوگ کہ جن کا تعلق جنگ کے محکمہ سے ہوتا ہے ان کی ملازمت اور روزگار کا انحصار جنگ پر ہوتا ہے' اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اس مسئلہ کو معروضی طور پر دیکھیں گے' یا وہ راہیں تلاش کریں گے کہ جن کی وجہ سے اسے ختم کیا جا سکے۔

جنگ کے گہرے مسائل پر جنرلوں' ایڈمرلوں' یا مارشلوں سے مشورہ لینا ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی دوا ساز سے کسی پرانی اور پیچیدہ بیماری کے بارے میں رائے لی جائے۔ وہ دواؤں کے بارے میں تو واقفیت رکھتا ہے' مگر یہ اس کا کام نہیں ہے کہ وہ بیماری کی وجوہات و نتائج کے بارے میں بھی رائے دے سکے' نہ ہی یہ اس کا شعبہ ہے کہ وہ بیمار کی نفسیاتی صورت حال کا تجزیہ کر سکے۔

عالمی تنظیم کا مسئلہ

جب کبھی کسی اتحاد میں کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے' اور جب اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی متوازن طاقت نہ ہو' تو اس صورت میں اتحاد کو برقرار رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اتحاد میں ہمیشہ سے کوئی ایک حریف اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ باختیار رہے' اور چھوٹے گروپ جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اتحاد کو باقی رکھیں تو اس کے نتیجہ میں انتشار اور پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور کسی قسم کی سیاسی وحدت قائم نہیں رہتی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ترقی کے عمل میں ضروری نہیں کہ اتحاد اس کا باعث ہو کیونکہ جہاں پر اتحاد ہوئے' وہاں نظریات اور خیالات میں یکسانیت پیدا ہو گئی اور اس کی وجہ سے نئے افکار تخلیق نہیں ہوئے یا ان کو نشونما کا موقع نہیں ملا۔ اور جہاں پر زبردستی اتحاد کو قائم کیا گیا تو اس صورت میں اس کے خلاف ردعمل کے طور پر ٹوٹ پھوٹ اور نا اتفاقی پیدا ہوئی۔

دیکھا جائے تو توانائی اختلاف سے پیدا ہوتی ہے اس لئے ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اختلاف کو برداشت کیا جائے اور انہیں دبایا نہیں جائے۔ اس لئے پائدار امن بھی اسی وقت قائم ہو سکتا ہے کہ جب باہمی طور پر ایک دوسرے کی نگہداشت کی جائے اور ایک متوازی طاقت کو برقرار رکھا جائے۔ عالمی امور میں طاقت کے توازن کا نظریہ ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ لیکن جس طرح سے توازن کے اس نظریہ کی یورپی تاریخ میں ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اس کے بجائے کوئی اور مستحکم طریقہ دریافت کیا جائے کہ جو امن کو باقی رکھ سکے۔ ان میں سے دو راستے ہیں کہ یا تو متحد ہوا جائے یا فیڈریشن قائم کی جائے۔ فیڈریشن زیادہ پرامید طریقہ ہے' کیونکہ اس میں باہمی تعاون کا اصول ہوتا ہے جو اسے زندگی اور توانائی دیتا رہتا ہے جب کہ اتحاد اجارہ داری کے اصول پر قائم ہوتا

ہے۔ اور طاقت پر اجارہ داری اس تاریخی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے جسے لارڈا یکٹن نے بیان کیا ہے "تمام قسم کی طاقتیں بدعنوانی کی جڑ ہیں' مگر مکمل طاقت مکمل طور پر بدعنوانی ہے۔" اگرچہ اس خطرہ سے فیڈریشن بھی آزاد نہیں' اس لئے دستوری ڈھانچہ میں اس قسم کے ادارے اور نکات ہوں کہ جو چیک اینڈ بیلنس" کر سکیں' صرف اسی طریقہ سے امن کو بحال رکھا جا سکتا ہے اور ملک میں اختلافات کو روکا جا سکتا ہے۔

نتائج

جنگ کے جراثیم اس عقیدے میں چھپے ہوئے ہیں کہ اچھے نتائج کو حاصل کرنے میں جو بھی ذرائع اختیار کئے جائیں وہ صحیح ہوں۔ لیکن اگر تاریخ سے کوئی سبق واضح طور پر سیکھا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ خراب طریقوں سے جو کچھ بھی حاصل کیا جائے گا وہ خراب ہی ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم ذرائع کو احتیاط سے استعمال کریں تو ان کا انجام فطری طور پر اچھا ہی ہو گا۔

ایک چیز جو ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی اچھے نتیجہ کی خاطر یہ کوشش کی جائے کہ جبر کے ذریعہ ترقی کو حاصل کیا جائے اور لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف کسی کام کو کرنے پر مجبور کیا جائے۔ تو تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ شدید ردعمل میں ہوتا ہے' اور تاریخ یہ سکھاتی ہے کہ اس کا یقینی اور موثر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ذہنی طور پر ترقی کے لئے تیار کیا جائے لوگوں کی راہنمائی کے لئے روشنی کی ضرورت ہے کسی ہنٹر کی نہیں۔ لوگوں کی فکر اور ذہن کو متاثر کرنا تاریخ میں سب سے زیادہ موثر طریقہ رہا ہے' چونکہ جو تبدیلی فکری اور ذہنی طور پر آتی ہے وہ ست رو ہوتی ہے اور آہستگی کے ساتھ آتی ہیں اس لئے بہت سے مفکرین اور مورخین اس کی اہمیت سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتے ہیں۔ اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان کے سوچنے کی اہلیت کی وجہ سے انسانی ترقی ہوئی ہے' لیکن فکر اور عمل کے درمیان جو فرق ہے اور عمل میں جو سنسنی خیزی ہے اس کی وجہ سے اب تک فکر نے انسانی تہذیب میں جو نمایاں حصہ لیا ہے' اس پر پوری توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ اگر حقیقت کی نظروں سے دیکھا جائے تو انسانی فکر میں معمولی اضافہ بھی اس سے بڑھ کر ہے کہ مادی طور پر ایک چیز بنائی جائے مگر وہ کچھ عرصہ بعد ہی گر جائے' ایک سلطنت فتح کی جائے مگر جلد ہی اس کا زوال ہو جائے' کسی تحریک کی راہنمائی پیدا ہو اور پھر وہ ختم ہو جائے۔

اس کے مقابلہ میں ذہنی طور پر سوچ میں بھی اگر اضافہ ہو تو اس کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ جب کوئی نظریہ تخلیق ہوتا ہے تو اس کے مقبول ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے خالق اور اس کے ماننے والوں کی ذہنی نشوونما ہو تاکہ وہ اس کو سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں، نظریہ کو تسلیم کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے ماننے والے آپس میں باہمی تعاون پر تیار ہوں۔ اس میں جو راہنمائی کی جاتی ہے اس میں فرد کی انفرادیت کو نہیں کچلا جاتا بلکہ اسے مزید اجاگر کیا جاتا ہے اور اس میں اعتماد اور جرات پیدا کی جاتی ہے۔ اگر اجتماعی طور پر کوئی عملی کام کیا جائے تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا مجمع کو یا لوگوں کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن اگر اجتماعی طور پر ذہنی ترقی کے لئے کچھ کیا جائے تو یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جب انفرادی طور پر لوگوں کے ذہن کو کشادہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ جب اس اصول کو مان لیا جائے کہ ایک فرد ترقی یا تنزلی کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے تو تاریخ کے تجربات کو ہم سیاسی اہمیت کے بجائے ذاتی اہمیت کی روشنی میں دیکھنے لگیں گے۔ ایک فرد تاریخ سے کیا سیکھتا ہے" زندگی گزارنے کے راہنما اصول اور طریقے ـــــــ وہ یہ سیکھتا ہے کہ اسے کیا نہیں کرنا چاہئے۔ سب سے اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ انسان کو مہذب طریقہ سے برتاؤ کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ وہ چیزوں کو صاف اور واضح دیکھ سکے، بلکہ یہ کہ وہ خود کو بھی واضح طور پر دیکھنے کی کوشش کرے۔

زندگی کو کھلی نظر سے دیکھنا، سچائی کو پانے کی خواہش کرنا، دوسروں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرنا، اور ان باتوں کے لئے کوشش کرنا کہ جن سے ایک عام آدمی کی زندگی پر مسرت اور خوشیوں سے مالا مال ہو یہ ایسے عزائم ہیں کہ جن کو پورا کرنے کی اگر کوشش کی جائے تو یہ انسان کو سکھائیں گی کہ اس کے راستہ میں کون سی مشکلات ہیں اور اس کا راستہ کس قدر کٹھن ہے۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ لوگ کیوں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ صداقت کی تلاش کے لئے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ صداقت کو تلاش کرنا اور اسے ثابت کرنا چاہتے ہیں انہیں اسی قسم کے تجزیہ اور تربیت کی ضرورت ہے جو کہ کسی اور چیز کے لئے ضروری ہے۔ اسے یہ سیکھنا پڑے گا کہ وہ کس طرح ہر قسم کی خواہش اور دلچسپی سے خود اپنی سوچ کو علیحدہ رکھے۔ اس میں کسی چیز کے بارے میں جو ہمدردی اور